یکم دسمبر ۲۰۱۸ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۱ ۔ شمارہ نمبر: ۲۳

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱۔۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱۔ معارف فیچر ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲۔ پیش کیا جانے والا لواز مہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لواز مہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳۔ معارف فیچر کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤۔ ہمارے فراہم کردہ لواز مے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵۔ معارف فیچر کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

بنگلا دیش میں جمہوریت کی موت

Atif Jalal Ahmad - Michael Kugelman

امریکی سفیر پر مسلح موٹر سائیکل سوار کا حملہ کرنا کوئی عام بات نہیں ہوتی، یہ واقعہ بنگلا دیش میں واشنگٹن کی سفیر مارسیا برنیسٹ کے ساتھ گزشتہ گرمیوں میں ہوا، مارسیا ۴ راگست کو ڈھاکا میں رات کے کھانے کے بعد ایک پارٹی سے نکلیں تو موٹر سائیکل سواروں نے پیچھا کر کے ان کی گاڑی پر پتھراؤ کیا اور نقصان پہنچائے بغیر چلے گئے۔ حملے میں ملوث کسی فرد کا نام کبھی سامنے نہیں آ سکا۔ اس واقعہ سے بنگلا دیش میں بڑھتے ہوئے تشدد اور سیاسی لڑائی کا اندازہ ہوتا ہے، جو ملک کو تبدیل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ حالیہ برسوں میں ایک جمہوری اور ماڈرن مسلم ملک میں ایک جماعتی نظام نافذ ہو چکا ہے۔ واشنگٹن کے پالیسی ساز بنگلا دیش پر کم ہی توجہ دیتے ہیں، اس کے باوجود حملے سے واضح ہوتا ہے کہ امریکا کو بھی ملک کی گندی سیاست میں کھینچ لیا گیا ہے۔ امریکی سفیر پر حملے سے کچھ دن قبل ۲۹ جولائی کو دو نوجوانوں کی ٹریفک حادثے میں ہلاکت پر پورے ڈھاکا میں احتجاج کیا گیا، مظاہرین جن میں اکثریت طالبعلموں کی تھی حکومت سے سڑکیں محفوظ بنانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مظاہرے تو پر امن تھے مگر مظاہرین کے خلاف سخت کریک ڈاؤن کیا گیا۔ مقامی میڈیا کے مطابق ڈھاکا کے مضافات میں حکومتی جماعت عوامی لیگ کی طلبہ تنظیم کے ارکان نے مظاہرین پر حملہ کر دیا، اس دوران کوریج کرنے والے صحافیوں پر بھی تشدد ہوا اور کیمرے چھین لیے گئے۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے احتجاج روکنے کے لیے یونیورسٹی کیمپس میں گھس آئے۔ حکومت کے مظاہرین سے نمٹنے کے طریقہ کار کے بارے میں الجزیرہ کو انٹرویو دینے کے بعد سماجی کارکن شاہد عالم کو پولیس نے اٹھالیا، مقامی میڈیا کے مطابق دوران حراست شاہد پر تشدد بھی کیا گیا۔ شاہد کو تین مہینے سے زیادہ قید رکھنے کے بعد بھی بنگلا دیش کے اٹارنی جنرل ہائیکورٹ کا حکم سپریم کورٹ میں چیلنج کرنا چاہتے ہیں۔ بنگلا دیش میں تنقید کرنے والوں سے جابر حکومت کا رویہ ایک افسوسناک معمول بن چکا ہے، اس کے لیے کئی مواقع پر ڈھاکا نے قانون کا سہارا بھی لیا ہے۔ گزشتہ ماہ پارلیمان نے ایک نیا قانون ''ڈیجیٹل سیکورٹی ایکٹ'' کے نام سے منظور کیا ہے۔ یہ قانون آن لائن اور سوشل میڈیا پر مواد کے حوالے سے ہے، اس قانون میں مبہم الفاظ میں لکھا گیا ہے کہ ''ناپسندیدہ اور جارحانہ مواد'' پر پابندی ہوگی۔ اس کے علاوہ صحافیوں کا کالم پسند نہ آنے پر حکومت ان کے خلاف بغاوت اور ہتک عزت کا مقدمہ بھی دائر کر سکتی ہے۔ حکومت نے ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر موجود افراد کے خلاف بھی کارروائی تیز کر دی ہے۔

گزشتہ نومبر میں سپریم کورٹ نے ججوں کی برطرفی کے اختیار کے حوالے سے حکومتی آئینی ترمیم کو مسترد کر دیا، جس کے بعد حکومت نے عدالت کے فیصلے پر شدید غصے کا اظہار کیا اور چیف جسٹس سورندر کمار سہنا کو بیرون ملک جانے پر مجبور کر دیا۔ بعد میں حکومت نے دعویٰ کیا کہ وہ چیف جسٹس پر بدعنوانی کے الزام میں مقدمہ چلانا چاہتی تھی۔ بعدازاں بنگلا دیش کے احتساب بیورو نے اعتراف کیا کہ چیف جسٹس کے خلاف بدعنوانی کا کوئی ثبوت موجود نہیں تھا۔ اب جسٹس سہنا امریکی حکومت سے پناہ طلب کر رہے ہیں۔

بنگلا دیش کی موجودہ جمہوریت انتہائی خوفناک ہے۔ ''رپورٹر وِد آؤٹ بارڈر'' کے مطابق آزادی صحافت میں بنگلا دیش کا نمبر ۱۸۰ ممالک میں ۱۴۴ واں ہے۔ ۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۷ء کے درمیان ''اکنامک انٹیلی جنس یونٹ'' کے جمہوری انڈکس میں ۱۶۷ ممالک میں بنگلا دیش ۸۵ سے ۹۲ نمبر کے درمیان رہا۔ سب سے بدترین تجزیہ مارچ ۲۰۱۸ء میں سامنے آیا، جب ''برٹلس مین'' رپورٹ میں بنگلا دیش کو آمریت کی درجہ بندی میں شامل کر لیا گیا، کیونکہ وہ جمہوریت کے کم ترین معیار پر پورا اترنے میں ناکام رہا تھا، جیسے شفاف الیکشن۔

۲۰۱۴ء کے انتخابات میں عوامی لیگ دوبارہ منتخب ہوئی تو کئی بیرونی مبصرین نے انتخابات کو ناقابل اعتبار قرار دیا۔ یہاں تک کہ انتخابات کی نگرانی کے لیے یورپی یونین نے تو اپنے مبصرین بھی بھیجنے سے انکار کر دیا۔ حزب اختلاف کی مرکزی جماعت ''بنگلا دیش نیشنلسٹ پارٹی'' نے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا، جس کی وجہ حکومت کی جانب سے الیکشن کرانے کے لیے نگراں حکومت قائم کرنے کے قانون کا خاتمہ کرنا تھا۔

اندرونی صفحات پر:۔

- چٹاگانگ کا چوہدری
- روس: خفیہ اداروں کے درمیان کشمکش
- پھر وہی مندر کی سیاست
- حماس کے لیے حمایت کا حصول
- سعودی عرب پر امریکا کی کمزور گرفت
- 'نیا ۱۰۰ دن، پرانا ۹ دن'
- جنگی جنون سے نفع کمانے والے
- اوپیک کا مخمصہ

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

حزب اختلاف کے بائیکاٹ پر ۳۰۰ میں سے ۱۵۳ نشستوں پر امیدوار بلا مقابلہ منتخب ہوگئے، یعنی پارلیمان کی آدھی سے زیادہ نشستوں پر انتخابات ہی نہیں ہوئے۔ گزشتہ چار برسوں میں حکومت نے حزب اختلاف کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ اپوزیشن جماعتوں بنگلادیش نیشنلسٹ پارٹی اور جماعت اسلامی کے ارکان کو جیل بھیج دیا گیا ہے۔ حکومت اپنے کریک ڈاؤن کو جائز بنانے کے لیے اس کو انسداد دہشت گردی مہم کا نام دیتی ہے۔ حکومت کے مطابق جماعت اسلامی کے جماعت المجاہدین سے تعلقات ہیں، جو ایک دہشت گرد تنظیم ہے، جس نے حالیہ عرصے میں کئی حملوں کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ حزب اختلاف بھی سیاسی تشدد کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ ۲۰۱۴ء میں انتخابات کے خلاف پرتشدد احتجاج کے دوران لندن میں بنگلادیشی سفارتخانے کو نقصان پہنچا، لیکن ان کا دہشت گردوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ڈھاکا حکومت کے اقدامات نے رہنما حزب اختلاف خالدہ ضیاء اور وزیراعظم حسینہ واجد کے درمیان طویل تلخ تعلقات کو انتہائی زہریلا بنا دیا ہے۔ حکومت اور اپوزیشن میں سے کوئی بھی مفاہمت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بنگلادیش کے لیے اگلے چند ماہ بہت اہم ہیں۔ وہاں جنوری میں انتخاب ہونے ہیں، آزاد اور منصفانہ انتخابات جمہوریت کی جانب لمبے سفر کا آغاز ہوں گے، لیکن اگر اپوزیشن کو پورا موقع نہیں دیا گیا تو بنگلادیش ایک جماعتی ریاست بن کر رہ جائے گا۔ گزشتہ فروری میں رہنما حزب اختلاف خالدہ ضیاء کو بدعنوانی کے الزام میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ بنگلادیش نیشنلسٹ پارٹی نے خالدہ ضیاء کی گرفتاری کی مذمت کرتے ہوئے اس کو انتخابی دھاندلی قرار دیا۔ پارٹی رہنماؤں کا کہنا تھا کہ اگر خالدہ ضیاء کو رہا نہیں کیا گیا تو الیکشن کا بائیکاٹ بھی کر سکتے ہیں۔ نیشنلسٹ پارٹی کے دیگر رہنماؤں کو بھی شدید دباؤ کا سامنا ہے۔ پارٹی کے مرکزی رہنما ''مرزا فخر الاسلام'' نے اکتوبر میں ایک پریس کانفرنس میں دعویٰ کیا کہ پارٹی کے خلاف ۳۰ دن میں ۴۱۰۰ مقدمات درج کیے گئے ہیں۔ اس دوران وزیراعظم حسینہ واجد نے توقع کے مطابق اعلان کیا کہ انتخابات کے انعقاد کے لیے حالات سازگار ہیں۔ بنگلادیش کے چیف الیکشن کمشنر کا کہنا تھا کہ میں منصفانہ انتخابات کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ رواں برس کئی جگہوں پر بلدیاتی انتخابات ہوئے اور پولنگ کے دوران بے قاعدگیوں کی شکایات سامنے آئیں۔

امریکی پالیسی سازوں کے لیے بنگلادیش میں غیر جمہوری طاقتوں کا مضبوط ہونا خاص معاملہ نہیں۔ موجودہ دور میں مضبوط لیڈر اور آمرانہ رجحانات دنیا بھر میں پروان چڑھ رہے ہیں، جس میں خود امریکا بھی شامل ہے۔ امریکی سفیر پر حملے سے واضح ہوتا ہے کہ امریکا بنگلادیش کی سیاست کے گرداب میں پھنس گیا ہے، یہ واشنگٹن کے لیے مکمل طور پر حیران کن نہیں تھا۔ حملے سے قبل امریکی سفارتخانے اور حکومت کے درمیان کشیدگی موجود تھی، امریکی سفیر نے حکومت پر کھلے عام تنقید کی تھی، جون میں نیشنل پریس کلب میں تقریر کے دوران امریکی سفیر نے بلدیاتی انتخابات میں اپوزیشن رہنما کو الیکشن لڑنے پر دھمکیاں دینے کی خبروں پر تشویش کا اظہار کیا تھا، جس کے جواب میں وزیراعظم حسینہ واجد کے بیٹے نے فیس بک پیغام میں امریکی سفیر کو بنگلادیش نیشنلسٹ پارٹی کا ترجمان قرار دے دیا تھا۔ امریکی سفیر پر حملے کی مذمت کرنے کے ساتھ ہی حکومت نے امریکی سفارت خانے پر تنقید بھی کی۔ حملے کے ایک دن بعد وزیر اطلاعات حسن الحق نے امریکا پر داخلی معاملات میں مداخلت کرنے کا الزام عائد کیا۔ یکم اگست کو وزیر قانون انیس الحق نے امریکی سفیر پر حکومت کو کمزور کرنے کی سازش کا الزام عائد کیا۔ حملے کے بعد امریکی سفارتخانے کے فیس بک پر جاری بیان میں پرامن احتجاج کے حق کی حمایت اور مظاہرین کے خلاف پرتشدد حکومتی کریک ڈاؤن پر تنقید کی گئی۔ اب بھی امریکی سفارت خانے کی جانب سے حکومتی پالیسی پر تحفظات کے اظہار کا سلسلہ جاری ہے۔ گزشتہ ماہ امریکی سفیر کی جانب سے ''ڈیجیٹل سیکورٹی ایکٹ'' کے ذریعے آزادی اظہار رائے کو جرم بنا دینے کے خدشے کا اظہار کیا گیا۔

ڈھاکا میں مارسیا برنیسٹ کی امریکی سفیر کی حیثیت سے مدت مکمل ہونے والی ہے۔ بنگلادیش کی سیاسی کشیدگی اب براہ راست واشنگٹن کو بھی متاثر کر رہی ہے۔ ستمبر میں کئی دن تک بنگلادیش نیشنلسٹ پارٹی کے عالمگیر نے واشنگٹن کا دورہ کر کے اہم شخصیات، پبلک ریلیشن فرم کے سامنے اپنی پارٹی کا مقدمہ پیش کیا۔ اس دوران ڈھاکا سے حکومت نے بنگلادیش پر نظر رکھنے والوں کو ای میل پیغام بھیجا، جس میں ڈھاکا حکومت کی کئی کامیابیوں، آزاد میڈیا اور حکومت کو حاصل وسیع عوامی حمایت کا ذکر کیا گیا۔ ان پیغامات میں حکومت پر تنقید کرنے پر سماجی کارکن شاہد عالم کی گرفتاری کا دفاع بھی کیا گیا اور دعویٰ کیا کہ ''اس نے جو کچھ کہا تھا، وہ خطرناک جھوٹ تھا''۔ اسی دن مختلف پبلک ریلیشنز گروپس نے بنگلادیش پر نظر رکھنے والوں کو بڑے پیمانے پر ان بکس پیغامات بھیجے، جس میں حکومت کے دعوؤں کی تردید کی گئی۔ سب سے پہلے ڈھاکا حکومت کی نمائندگی کرنے والی ایک تنظیم نے دوپہر کے کھانے کے وقت حکومتی کامیابیوں کے حوالے سے پیغامات بھیجے۔ جس کے چند گھنٹے بعد بنگلادیش نیشنلسٹ پارٹی کے ایک گروپ نے ''بنگلادیش میں جمہوریت کیسے تاریک ہوئی'' کے پیغامات بھیجے۔ لگتا ہے کہ واشنگٹن بنگلادیش کی حکومت اور اپوزیشن کے درمیان جاری بیانیے کی جنگ کا میدان بن گیا ہے۔ اس تمام صورتحال میں ٹرمپ انتظامیہ کا اپنا نقطۂ نظر ہے۔

بنگلادیش میں سیاسی عدم استحکام کی بڑی وجہ ریاست کے خلاف غصہ ہے اور انتہا پسند عناصر اس کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بنگلادیشی عسکریت پسندوں اور داعش کے مقامی حامیان کی جانب سے دہشت گردوں کی مالی معاونت کی جاتی ہے، ان عناصر کے خلاف گزشتہ دو برس سے بڑے پیمانے پر ریاستی کریک ڈاؤن جاری ہے، جس سے عسکریت پسندوں کو نقصان پہنچا ہے۔ حکومت کے اپوزیشن کے خلاف جابرانہ اقدامات سے انتہا پسندی کی نئی لہر پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ انتخاب اگر غیر منصفانہ ہوئے تو حزب اختلاف کی جانب سے حکومت کی مخالفت اور بڑھ جائے گی، اپوزیشن میں ایسے عناصر بھی شامل ہیں جو پرتشدد کارروائیوں میں ملوث ہیں اور ان کے دہشت گردوں سے خفیہ تعلقات بھی ہیں۔ یہ صورتحال امریکا کے لیے انتہائی تشویش ناک ہونی چاہیے، کیونکہ امریکا طویل عرصے سے جنوبی ایشیا میں استحکام کو اپنا عظیم ترین مفاد سمجھتا ہے۔ واشنگٹن کی طرف سے بنگلادیش پر درست اقدامات کے لیے ڈباؤ ڈالا جا سکتا ہے، جیسے الیکشن کی نگرانی کے لیے حکومت اور حزب اختلاف کی جماعتوں پر مشتمل نگراں حکومت کا قیام اور الیکشن سے قبل پارلیمان کو تحلیل کرنا، لیکن امریکی سفارت خانے اور ڈھاکا کا حکومت کے درمیان کشیدگی کی وجہ سے امریکی دباؤ کارگر ثابت نہیں ہوگا اور بنگلادیش میں انتہائی سیاسی کشیدگی کے ماحول میں حکومت سے اس طرح کے اقدامات کی امید کرنا بہت بڑی بے وقوفی ہوگی۔

اس وقت بنگلادیش میں جمہوریت درمیان میں جھول رہی ہے اور آئندہ انتخابات کے لیے ۳۰ دسمبر کی تاریخ دی گئی ہے، یہ انتخابات ایک خطرناک موڑ ثابت ہوں گے۔ چند ہفتے قبل ہماری عوامی لیگ اور بنگلادیش نیشنلسٹ پارٹی کے نوجوان کارکنان کے گروپ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ہماری کئی باتوں سے اختلاف کیا، مگر حیران کن طور پر وہ ہماری ایک بات سے متفق تھے، ''آزادانہ اور منصفانہ انتخابات ہی ملک کو بہتری کی طرف لے جا سکتے ہیں۔'' اس حوالے سے چند ماہ قبل ایک سروے بھی کیا گیا تھا، جس سے پتا لگا کہ جمہوریت کے استحکام کے لیے حکومتی کارکردگی پر عوام کا عدم اعتماد بڑھتا جا رہا ہے اور عوام کی بڑی تعداد انتخابات میں ووٹ ڈالنے کا ارادہ رکھتی

ہے۔رائے عامہ کے سروے ظاہر کرتے ہیں کہ بنگلا دیشیوں کی بڑی تعداد سیاسی جماعتوں کے درمیان تعاون میں اضافہ چاہتی ہے۔حالیہ دنوں میں عوامی لیگ اور بنگلا دیش نیشنلسٹ پارٹی کے سابق اور بڑے رہنماؤں پر مشتمل نیا اتحاد ''جاتیا اوکیان فرنٹ'' کے نام سے تشکیل دیا گیا ہے، جس سے دو جماعتوں کی لڑائی میں پھنسے عوام کے لیے ایک تیسرے راستے کی امید پیدا ہوئی ہے۔عوامی لیگ کی جانب سے اوکیان فرنٹ سے آئندہ انتخابات پر دو بار مذاکرات کیے گئے مگر دونوں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ہوسکتا ہے کہ بنگلا دیشیوں میں قابل اعتبار انتخابات اور سیاسی ہم آہنگی کے ماحول کی شدید طلب موجود ہو، لیکن بدقسمتی سے ملک کے موجودہ حالات میں اس خواہش کا پورا ہونا انتہائی مشکل ہے۔

(ترجمہ: سید طالوت اختر)

"The death of democracy in Bangladesh".
("nationalinterest.org". Nov.15, 2018)

بقیہ: جنگی جنون سے نفع کمانے والے

ہے وہاں سے آکر امریکا میں آباد ہونے والوں سے بھی امریکی سلامتی خطرے میں ہے۔مسلم دنیا کو امریکا نے خاص طور پر نشانہ بنایا ہے۔افغانستان، عراق، شام، لبنان اور مصر کو تباہ کرنے میں امریکا کا ہاتھ ہے۔ایسے میں یہ توقع کیوں کر کی جاسکتی ہے کہ ان ممالک سے تعلق رکھنے والے افراد ہر حال میں امریکا سے صرف محبت کرتے رہیں گے؟ کل کو انہی لوگوں سے چند گروپ اٹھ کر امریکی سرزمین پر بھی قیامت برپا کرسکتے ہیں۔اور پھر مسلم دنیا تنہا نہیں ہے۔ویت نام، پاناما، نکاراگوا، کیوبا اور دوسرے بہت سے ممالک میں تو امریکا سے شدید نفرت کرنے والوں کی کمی نہیں۔ان ممالک کو امریکا نے عشروں تک پامال کیا ہے۔کل کو ان ممالک سے تعلق رکھنے والے بھی تو امریکا سے اپنی نفرت کا بھرپور اظہار کسی واقعے کی صورت میں کرسکتے ہیں۔امریکا میزائل شیلڈ قائم کرکے بیرونی میزائلوں سے بچ سکتا ہے مگر اندرونی میزائلوں سے بچاؤ کس طور ممکن ہوگا؟ امریکی عوام بہت سے سوالوں کے جواب چاہتے ہیں مگر جنگی جنون کو ہوا دینے والوں کے پاس کسی بھی سوال کا کوئی جواب نہیں۔وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ جنگیں چھیڑی جاتی رہیں، خانہ جنگیاں ہوتی رہیں، ممالک برباد ہوتے رہیں، اسلحہ ساز ادارے تینوں شفٹوں میں کام کرتے رہیں اور ان کی تجوریاں بھری جاتی رہیں، جو جنگی جنون کی کوکھ سے ذاتی فوائد بٹورتے رہنے کو مکمل طور پر درست اور جائز سمجھتے ہیں۔

| | |

چٹاگانگ کا چوہدری

رؤف کلاسرا

ہمارے ہاں کوئی بندہ بات بھول جائے تو طنزیہ کہا جاتا ہے: آپ بوڑھے ہو رہے ہیں۔

بھول جانے سے انسان ڈرتا ہے۔باتیں یاد رہ جائیں تو بھی۔کہیں پڑھا تھا: بھولنا بھی نعمت سے کم نہیں۔اگر آپ تلخ یادیں یا تکلیف دہ لمحات نہیں بھولیں گے تو ہر لمحہ اذیت میں گزرے گا لہٰذا خدا نے انسان کے اندر بھولنے کی صلاحیت رکھی ہے۔انسان پرانی باتیں نہیں بھولے گا تو نئی چیزیں دماغ میں کیسے جگہ بنائیں گی؟ دوسری طرف یہ حالت ہے کہ بعض تکلیف دہ یادیں بھولنا چاہیں تو بھی فیس بک آپ کو بھولنے نہیں دیتی۔اسی فیس بک نے یاد دلایا: ۲۲ نومبر ۲۰۱۵ کو میں نے ایک ٹویٹ کیا تھا، جو ان دنوں فیس بک پر بھی اپ لوڈ ہوجاتا تھا۔اس پرانے ٹویٹ کو پڑھ کر بہت سی تلخ یادیں حملہ آور ہوئیں۔

یہ ٹویٹ بنگلا دیش کے سیاسی لیڈر صلاح الدین قادر چوہدری کے بارے میں تھا۔وہ جنرل ایوب کی متحدہ پاکستان کی آخری اسمبلی کے اسپیکر فضل قادر چوہدری کے بیٹے تھے۔صلاح الدین چھ دفعہ بنگلا دیشی پارلیمان کے رکن بنے۔بہاولپور میں صادق پبلک اسکول میں پڑھے۔دوستوں میں نمایاں نام اسحاق خاکوانی اور محمد میاں سومرو کے تھے۔

صلاح الدین سے میری پہلی ملاقات ۲۰۰۸ء میں ہوئی تھی، جب وہ پاکستان آئے ہوئے تھے۔طالب علمی کا دور بہاولپور میں گزرا لہٰذا سرائیکی زبان بھی بول لیتے تھے۔پروگرام بنا کہ صوبہ پختونخوا میں ڈاکٹر زبیر کے فارم ہاؤس پر چلے گئے جو وہاں دریا کے کنارے پر تھا۔پڑھے لکھے، نفیس اور خوبصورت شخصیت کے مالک ڈاکٹر زبیر نگران وزیراعظم ملک معراج خالد کے دور میں نگران وزیر بھی رہے تھے۔اس فارم ہاؤس پر خاصا وقت اکٹھے گزارا۔ڈاکٹر زبیر کی مہمان نوازی کا جواب نہیں۔دریا کنارے ان کے ہٹ پر گزری وہ دوپہر آج تک دل اور دماغ سے نہیں اتری۔اسحاق خاکوانی میں حسِ مزاح بہت ہے اور صلاح الدین بھی کم نہ تھے۔میں اور زبیر صاحب، اُن دونوں کے دوستانہ اور بے تکلفانہ جملوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ہم سب اس وقت دریا کنارے سے واپس لوٹے جب سارے دن کی مشقت کے بعد تھکا ہارا سورج کہیں دور ڈوب رہا تھا۔اس ملاقات میں وہ مجھے بہاولپور اور ملتان میں گزرے دنوں کی باتیں سناتے رہے۔صلاح الدین نے مجھے کہا کہ دو تین ماہ بعد بنگلا دیش میں انتخابات ہو رہے ہیں۔میں ڈھاکا آکر انتخابات کور کروں، میں نے وعدہ کرلیا۔دو تین ماہ بعد میں ڈھاکا ایئرپورٹ پر اترا تو مجھے لینے ایک ڈرائیور صلاح الدین نے بھیجا ہوا تھا۔میں نے گیسٹ ہاؤس میں ایک کمرہ لیا۔اگلے دن صلاح الدین کے گھر گیا تو الیکشن کا رش لگا ہوا تھا۔تھوڑی دیر کے لیے ملاقات ہوئی۔صلاح الدین چوہدری مسکرانے اور قہقہے لگانے والے انسان تھے۔مجھے کہا: آپ الیکشن کور کرلیں، پھر ملتے ہیں، کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتائیں۔خیر الیکشن ہوگئے۔خالدہ ضیا اور صلاح الدین کی پارٹی ہار گئی تھی۔

میرا واپسی کا پلان بن رہا تھا کہ ان کا فون آیا، بولے: گھر آجاؤ، رات کا کھانا اکٹھے کھاتے ہیں۔گھر پہنچا تو ان کی بیگم صاحبہ نے کھانا بنایا ہوا تھا۔پاکستان میں بنگلا دیش کی خاتون سفیر بھی موجود تھیں۔لمبی گپ شپ لگی۔صلاح الدین کی پارٹی الیکشن ہار چکی تھی اور حسینہ واجد وزیراعظم بننے جارہی تھیں۔وہ کافی پریشان نظر آئے۔کہنے لگے: واپس جاکر اپنے فارن آفس کو بتائیں کہ اب بنگلا دیش وہ نہیں رہے گا جو پہلے تھا، اب بھارت نواز لابی کا اثر ورسوخ بڑھے گا اور ان جیسے سیاستدانوں کے لیے مشکلات بڑھیں گی جنہیں پاکستان نواز سمجھا جاتا ہے۔انہی دنوں وزیراعظم گیلانی خواجہ القما کو ڈھاکا کا ہائی کمشنر کے طور پر بھیجنا چاہتے تھے۔خواجہ صاحب بعد میں ملتان یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔صلاح الدین کہنے لگے: بنگلا دیش میں وقت بدل رہا ہے۔ان کی تعیناتی یہاں منفی لی جائے گی، کیونکہ خواجہ القما کے والد خواجہ خیر الدین کے بارے میں قوم پرستوں کا مختلف نظریہ ہے' وہ انہیں قبول نہیں کریں گے۔وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے والد بنگلا دیش کے قیام کے وقت پاکستان کے حامی تھے، لہٰذا ان کا انتخاب مناسب نہ ہوگا کیونکہ اب حسینہ واجد سیاسی مخالفین سے چُن چُن کر بدلہ لیں گی۔

مجھے علم نہ تھا کہ صلاح الدین ہی حسینہ واجد کے انتقام کا پہلا نشانہ ہوں گے۔کچھ عرصے بعد اسحاق خاکوانی سے پتا چلا کہ انہیں حسینہ واجد نے گرفتار کرکے قتل کے مقدمہ میں پھنسا دیا ہے۔مقدمہ مشرقی پاکستان میں سول وار کے دنوں میں

ہونے والے ایک قتل کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا، جب صلاح الدین پنجاب یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ اسحاق خاکوانی نے انہیں بچانے کے لیے ریکارڈ اکٹھا کیا اور بنگلا دیش بھیجا۔ محمد میاں سومرو، خاکوانی اور دیگر دوستوں نے بنگلا دیش جانے کے لیے ویزہ کی درخواست دی، تاکہ وہ عدالت میں گواہی دے سکیں کہ جس دور کی یہ بات ہو رہی ہے، اس وقت صلاح الدین پاکستان میں تھا۔ سب نے اپنے بیان حلفی بھی عدالت کو بھجوائے۔ بنگلا دیشی حکومت نے ویزے دینے سے انکار کیا اور ایک دن صلاح الدین کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ پھانسی کی سزا سُن کر صلاح الدین ایک لمحے کے لیے بھی نہ گھبرائے اور زور سے عدالت میں جج سے کہا: آپ نے کون سا نیا فیصلہ سنایا ہے، کل دن سے آپ کا یہ فیصلہ، جو دراصل حسینہ واجد کی وزارت قانون نے لکھ کر آپ کو بھجوایا، انٹرنیٹ پر چل رہا ہے، آج آپ نے وہی پڑھ کر سنا دیا ہے۔

اسحاق خاکوانی نے جنرل مشرف اور دیگر کے ذریعے کوششیں جاری رکھیں کہ سعودی عرب، ترکی اور دیگر مسلمان ملکوں سے دباؤ ڈلوا کر صلاح الدین کی جان بخشی کرائی جائے، لیکن حسینہ واجد صلاح الدین کو پھانسی دینے پر تلی ہوئی تھیں اور اس کے پیچھے بھارتی لابی تھی کیونکہ صلاح الدین کو بھارت مخالف اور پاکستان نواز سیاستدان گردانا جاتا تھا۔ نواز شریف دور کا پاکستانی دفتر خارجہ ان دنوں گونگا بنا ہوا تھا۔ پاکستان کے حامی جماعت اسلامی کے راہنماؤں کی پھانسیوں کے ایشو کو عالمی سطح پر اٹھایا گیا، نہ اس کے خلاف بھرپور احتجاج ہی کیا گیا۔

یہ تاریخ کا انوکھا ٹرائل تھا، جس میں ملزم کو اپنے گواہان پاکستان سے لانے کی اجازت نہ دی گئی۔ اور تو اور ایک انگریزی میڈیا گروپ کی مالکہ عنبر سہگل تک نے حسینہ واجد سے ڈھاکا میں رابطہ کیا، تاکہ انہیں بتایا جا سکے کہ صلاح الدین بے قصور ہے کیونکہ وہ اس زمانے میں کراچی میں ان کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ ان کے والد اور صلاح الدین کے والد دوست تھے۔ مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن شروع ہونے سے پہلے ہی وہ اپنے بیٹے کو کچھ دن کے لیے کراچی ان کے گھر چھوڑ گئے تھے تاکہ وہاں سے وہ لاہور جا کر پنجاب یونیورسٹی میں پڑھ سکے۔ عنبر نے فون اس تعلق کی بنیاد پر کیا تھا کہ متحدہ پاکستان کے دنوں میں شیخ مجیب کے اس گروپ کے مالکان سے قریبی تعلقات تھے۔ عنبر سہگل ان پرانے تعلقات کا حوالہ دے کر بے گناہ صلاح الدین چوہدری کی جان بخشی کرانا چاہتی تھیں، لیکن یہ کوشش بے سود رہی۔ حسینہ واجد پاکستان اور اپنے باپ کی پاکستانیوں سے پرانی دوستیاں بھلا چکی تھیں۔ ان کے سر پر صرف انتقام سوار تھا۔ آخر ایک دن صلاح الدین کی سب اپیلیں خارج کر دی گئیں اور انہیں پھانسی چڑھا دیا گیا۔

صلاح الدین کی پھانسی کے بعد ڈھاکا کے ایک اخبار میں یہ خبر چھپی: صلاح الدین نے حسینہ واجد سے معافی کی اپیل کی تھی، جو وزیراعظم نے مسترد کر دی تھی۔ اس پر صلاح الدین کے بیٹے نے اخباری بیان جاری کیا تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے، اس کے باپ نے ہرگز رحم کی اپیل نہیں کی تھی بلکہ خاندان کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ اس کی زندگی کی بھیک حسینہ واجد سے نہیں مانگی جائے گی۔ بیٹے کے بقول جب اس کے باپ کے سامنے معافی کی درخواست رکھی گئی تو انہوں نے اٹھا کر پھینک دی تھی اور کہا تھا: What rubbish?

میں نے ٹویٹر اور فیس بک پر صلاح الدین کے بیٹے کا وہ بیان شیئر کیا تھا۔ میں بھی اپنے تئیں چٹا گانگ کے اس چوہدری کو بھول چکا تھا، لیکن آج تین سال بعد چٹا گانگ کا وہ چوہدری پھر میرے سامنے ہنستا مسکراتا قہقہے لگاتا آ کھڑا ہوا تھا۔

بعض انسان ایسے ہوتے ہیں کہ آپ انہیں پھانسی دے کر منوں مٹی تلے دفن کر دیں تو بھی تاریخ انہیں مرنے نہیں دیتی۔

شاید چٹا گانگ کا چوہدری بھی بہادروں کی اسی غیر معمولی نسل سے تعلق رکھتا تھا!

(بحوالہ: روزنامہ ''دنیا'' کراچی۔ ۲۳ نومبر ۲۰۱۸ء)

بقیہ: اوپیک کا مخمصہ

امکان زیادہ ہے کہ ارکان تیل کی پیداوار اس حد تک گھٹانے پر راضی نہ ہوں گے کہ معاملات ہاتھ سے جاتے رہیں اور اس قدر بڑھانے پر بھی رضامند نہ ہوں گے کہ سب کے پاس اضافی تیل کے ذخائر بڑھ جائیں۔ ایسی کوئی بھی صورتِ حال عالمی منڈی میں تیل کی قیمت میں مزید گراوٹ کا باعث بن سکتی ہے۔ نیوٹرل زون میں سعودی عرب اور کویت کی طرف سے تیل کی پیداوار بحال کرنے کے حوالے سے مشترکہ اقدامات میں بھی فی الحال تاخیر دکھائی دے رہی ہے، کیونکہ پیداوار بحال کیے جانے کی صورت میں عالمی منڈی میں تیل کی قیمت مزید گراوٹ کا شکار ہو سکتی ہے۔ مگر خیر، سیاسی محرکات کے تحت کوئی بھی فیصلہ کسی بھی وقت تبدیل ہو سکتا ہے۔ وقت نے ثابت کیا ہے کہ سیاسی محرکات عقلی تقاضوں کے مطابق کیے جانے والے فیصلوں کو رد کر دیا کرتے ہیں۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

'OPEC's dilemma-markets are complicated!".
("Center for Strategic and International Studies". November 13, 2018)

بقیہ: پھر وہی مندر کی سیاست

حوالے سے کوئی جامع حکمتِ عملی اب تک مرتب نہیں کی جا سکی ہے۔ گزشتہ برس حکومت نے سپریم کورٹ کو بتایا کہ ۲۰۱۳ء سے اب تک ۱۲ ہزار سے زائد کسان خودکشی کر چکے ہیں۔

بھارت میں اب تک خام قومی پیداوار بڑھانے پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ مجموعی قومی پیداوار کا بڑھنا کسی بھی اعتبار سے بھرپور قومی ترقی کا ضامن نہیں ہوا کرتا۔ سوال پالیسیوں میں توازن کا ہے۔ بی جے پی کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ بنیادی مسائل حل کرنے پر توجہ دے اور رام مندر کی تعمیر کا معاملہ سپریم کورٹ پر چھوڑ دے۔ نریندر مودی نے ۲۰۱۴ء میں جن اچھے دنوں کی آمد کی نوید سنائی تھی، وہ اچھے دن اب تک نہیں آئے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"India's ruling party back to temple politics ahead of 2019 elections".
("southasianmonitor.com". November 28, 2018)

I I I

بقیہ: ٹرمپ کی خارجہ پالیسی کے لیے ''تالیاں''

دوچار ہوئے ہیں۔ دنیا بھر سے سستی اشیا کی درآمد نے امریکی صنعتوں کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ اب اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ نوکریوں کی آؤٹ سورسنگ سے گریز کیا جائے اور درآمدات کا گراف بھی نیچے لایا جائے۔

کوئی ڈونلڈ ٹرمپ کو پسند کرے یا نہ کرے، ایک بڑی حقیقت کسی بھی طور نظر انداز نہیں کی جانی چاہیے۔ سوویت یونین کی تحلیل نے عالمی سیاست میں واحد سپر پاور کی حیثیت سے امریکا کی پوزیشن بدل دی ہے۔ کل تک پوری دنیا امریکا کی طرف دیکھتی تھی کیونکہ ایک بہت بڑا خطرہ سوویت یونین کی شکل میں موجود تھا۔ دنیا دو بلاکس میں بٹی ہوئی تھی۔ اب بلاک زیادہ ہیں۔ کئی طاقتیں ابھر چکی ہیں اور ان کے ابھرنے کا عمل رکا نہیں۔ کئی بڑے ممالک مل کر بھی سپر پاور کی سی حیثیت میں کام کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ چین اور روس کا ایک پلیٹ فارم پر آنا بھی اسی امر کی طرف اشارا کرتا ہے۔ امریکی پالیسی سازوں کو بھی یہ نکتہ سمجھنا ہوگا کہ اب امریکا کے لیے میدان خالی نہیں رہا۔ مل جل کر کام کرنے کا زمانہ آ چکا ہے۔ اگر من مانی کی جائے گی تو اس کے نتائج بھی بھگتنا ہوں گے۔ یہ سب کچھ جس قدر جلد سمجھ میں آ جائے اُتنا ہی اچھا ہے۔

"Three cheers for Trump's foreign policy: What the establishment misses".
("Foreign Affairs". Sep-Oct., 2018)

I I I

روس: خفیہ اداروں کے درمیان کشمکش

Tatiana Stanovaya

مغربی ذرائع ابلاغ نے روسی ایجنٹ کے برطانوی شہر سلیسبری میں موجودگی کا انکشاف کیا تو روسی حکومت کو بڑا دھچکا لگا، حالانکہ روس نے حالیہ برسوں میں ایک بار پھر مضبوط انٹیلی جنس سروس قائم کرلی ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد یہ واقعہ روسی انٹیلی جنس سروس کی سب سے بڑی ناکامی ہے، اب دیکھنا ہوگا کہ کریملین کس طرح اپنی انٹیلی جنس سروس کو منظّم کرتا ہے۔ اہم ترین سوال یہ ہے کہ روس کس طرح اپنی ملٹری انٹیلی جنس سروس کو موثر اور بہتر بنانے کے لیے اقدامات کرتا ہے، جی آر یو (روسی خفیہ ایجنسی) اپنے لوگوں کی حفاظت کس طرح یقینی بنائے گی اور مستقبل میں کسی طرح ناکامیوں سے بچا جاسکتا ہے؟

''جی آر یو'' کو ختم کرنے، اعلیٰ افسران کو سزا دیے جانے یا نوکری سے ہی نکال دیے جانے کی افواہیں گردش میں ہیں۔ حالاں کہ حکومت فوجی خفیہ ایجنسی کو از سرِ نو مضبوط بنانے کی کوشش کررہی ہے۔ ابتدائی طور پر کچھ اہلکاروں کو تبدیل کیے جانے کا امکان ہے، افواہ ہے کہ ''جی آر یو'' کے سربراہ Igor Korobov کو شاید تبدیل کردیا جائے، لیکن اس سے کیا ہوگا، جی آر یو کو اب بھی صدر پوٹن کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ حقیقت میں جی آر یو اب پہلی جیسی نہیں رہی، اگرچہ مغربی میڈیا اب بھی اس ایجنسی کا ذکر پہلے ہی کی طرح کرتا ہے۔ ''جی آر یو'' کی مشکلات روسی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اندر نئی لڑائی کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔ ہر ایجنسی صورتحال کا فائدہ اٹھا کر دوسرں پر الزام لگانا چاہتی ہے۔ ایس وی آر (فاران انٹیلی جنس سروس) جی آر یو کی کمزوری کی نشاندہی کرتے ہوئے سیاسی انٹیلی جنس کی ذمہ داری دوبارہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ کے جی بی کی جگہ لینے والی ''ایف ایس بی'' ایک بار بھی ''ایس وی آر'' کو خود میں ضم کرنے کی کوشش کرسکتی ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کے مطابق ہوسکتا ہے کہ ''ایس وی آر'' کے ایجنٹ نے برطانیہ میں سلیسبری آپریشن کی معلومات افشا کی ہوں۔ ایف ایس بی اس نکتہ نظر کو اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کے لیے استعمال کرسکتی ہے۔ روسی ایجنٹ کی موجودگی ظاہر ہونے کے واقعہ کو یہ ایجنسیاں ایک دوسرے کے خلاف بداعتمادی پھیلانے کے لیے استعمال کررہی ہیں۔

ایک اخبار کے مطابق ایس وی آر کے سربراہ Nary shkin کے خاندان کے پاس نہ صرف ہنگری میں رہائش کا اجازت نامہ ہے بلکہ وہاں اس خاندان کے جائیدادیں بھی موجود ہیں۔ یہ خبر Nary shkin کی حیثیت کو کمزور بناتی ہے اور شک پیدا کرتی ہے کہ جی آر یو نے انتقام لینے کے لیے معلومات افشا کیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سچ نہ ہو لیکن صورتحال واقعی بہت خراب ہے۔ کریملین نے ۲۰۱۶ء میں ''ایس وی آر'' اور ''ایف ایس بی'' کو ضم کرنے پر غور کیا تھا، لیکن پوٹن نے ایجنسیوں کو ضم کرنے کے بجائے Nary shkin کو ایس وی آر کا سربراہ مقرر کردیا۔ جس کے بعد ڈوما کے اسپیکر نے ایس وی آر کے سربراہ کی حیثیت سے ایجنسی کو ضم کرنے سے انکار کردیا۔ ۲۰۱۸ء میں جب توقع کی جارہی تھی کہ جلد روسی ریاستی ڈھانچے میں بڑی تبدیلیاں کی جائیں گی تو ایف ایس بی نے ایک بار پھر دوسری ایجنسیوں کو خود میں ضم کرنے کا منصوبہ خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ لیکن صدارتی عملے کے سابق سربراہ کی وجہ سے تبدیل نہیں لائی جاسکی۔ معلومات افشا ہونے کے واقعہ کے بعد ایف ایس بی کو اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لیے نئی دلیل مل گئی ہے۔

سرگئی اسکرپل پر کیمیائی حملہ پوٹن کے نظر میں سیکورٹی ایجنسیوں کے درمیان تناؤ کی ایک مثال ہے اور یہ تناؤ کوئی کل شروع نہیں ہوا ہے۔ اس بات کا اظہار روسی توانائی فورم میں پوٹن کی متنازع اور جذباتی تقریر سے بھی ہوتا ہے۔ ''اکنامسٹ'' میگزین نے کیمیائی حملے پر مغربی خفیہ ایجنسیوں کا نقطہ نظر بھی بیان کیا ہے۔ ''سلیسبری حملہ روس کا بہت بڑا اقدام ہے، روس نے انٹیلی جنس ایجنسی کو حملے کے لیے استعمال کرکے جاسوسی کی دنیا کا پرانا اصول توڑ دیا ہے''۔ روس اس معاملے کو مختلف طریقے سے دیکھتا ہے، اس کے مطابق ''یہ مغرب ہے جو ایک معمول کے آپریشن کو بڑھا چڑھا کر پیش کرکے اصولوں کو توڑ رہا ہے''۔ اصولی طور پر یہ صرف جاسوسی کا معاملہ نہیں بلکہ اس سے مغرب جمہوری اور سیاسی لحاظ سے کمزور ہوا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ امریکی، فرانسیسی اور چینی خفیہ ایجنسیاں کس طرح کام کرتی ہیں، لیکن ہم کو کریملین میں دنیا ہی الگ نظر آتی ہے۔ پوٹن کو یقین ہے کہ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد بھی امریکا روس کو کمزور کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے اور روس میں پوٹن کی حکومت مضبوط ہونے کے بعد امریکا نے اپنی ان کوششوں کو دگنا کردیا ہے۔ جارجیا اور یوکرائن بحران کے دوران مغربی اقدامات بھی تنازع بڑھانے کی وجہ بنے۔

کریملین کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ واشنگٹن ہی تمام مغربی ممالک کو روس کے خلاف اقدامات کرنے کا حکم دیتا ہے اور وہ پوٹن حکومت کے ساتھ روس کی بھی تباہی چاہتا ہے۔ روسی صدر کئی مرتبہ مغرب پر روس کے سیاسی نظام اور انتخابات میں مداخلت کرنے کا الزام عائد کرچکے ہیں۔ اس کام کے لیے مغرب نے روس میں پورا نیٹ ورک بھی بنا رکھا ہے، جس میں تاجر، مغرب نواز حزب اختلاف اور غیر سرکاری تنظیمیں شامل ہیں۔ اسی سوچ کی وجہ سے سلیسبری حملے کے بعد ''جی آر یو'' میں کمزوریاں ڈھونڈنے کے بجائے ماسکو نے اس واقعہ کو اپنے خلاف جاری مغربی جنگ کا حصہ سمجھ لیا۔ روس کے ریاستی میڈیا پر دکھائے جانے والے پیغامات سے اندازہ ہوتا تھا کہ کریملین بری طرح مغربی ''ہسٹیریا'' کا شکار ہوگیا تھا۔

روسی خفیہ ایجنسیوں اور ان کے اندرونی و بیرونی ایجنٹوں کے لیے اس سے کیا پیغام گیا ہوگا، صرف ایک کہ روسی حکومت ذمہ دار اور محتاط خفیہ ایجنسیاں بنانے کی کوشش نہیں کررہی، نہ ہی تمام ایجنسیز سے غیر امتیازی سلوک کیا جائے گا اور سائبر جاسوسی کی جنگ کے خاتمے کا بھی امکان نہیں ہے، ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے مغرب کی پالیسی بھی برقرار رہے گی۔ بہرحال حکومت کو ان مشکلات سے نکلنے کا طریقہ معلوم ہے اور ہوسکتا ہے وہ اس پر عمل بھی کرے۔ سیاسی قیادت اور خفیہ ایجنسیوں کے درمیان مضبوط تعلقات کا قیام بھی مشکلات سے نکلنے کا ایک طریقہ ہوسکتا ہے اور یہ تعلقات اب مضبوط ہی ہوں گے۔ کیمیائی حملے کے حوالے سے سخت اقدامات کرنے کی باری اب سلامتی کونسل کی ہے۔ قدامت پسند اور مغرب مخالف خفیہ ایجنسیاں کونسل پر اثر انداز ہوتی ہیں، جس کے اثرات کونسل کے تزویراتی اور روزمرہ کے فیصلوں میں بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ خفیہ اداروں کی جانب سے حملہ کرنے کی خواہش کا نتیجہ ان کے ایجنٹس کے بے نقاب ہونے کی شکل میں برآمد ہوتا ہے، روس میں کام کرنے والے مغربی ایجنٹس کے لیے بھی یہ ایک سبق ہے کہ دنیا کی ہر خفیہ ایجنسی میں کوئی نہ کوئی کمی اور خرابی موجود ہوتی ہے۔ روس اب معلومات کی جنگ زیادہ کھل کر لڑسکتا ہے، اس حوالے سے روس سے براہ

باقی صفحہ نمبر ۹

ٹرمپ کی خارجہ پالیسی کے لیے ''تالیاں''

دوسرا اور آخری حصہ

Randall Schweller

اس وقت عالمی تجارت کے حوالے سے امریکا کا شدید اور مضبوط ترین حریف صرف چین ہے۔ امریکا نے چین پر بھی تجارت کے حوالے سے دباؤ ڈال کر مختلف معاملات میں رعایتیں یقینی بنائی ہیں۔ چین سے تجارت میں امریکی خسارہ ۳۷۵؍ارب ڈالر سے زائد ہے۔ چینی حکام نے مذاکرات کے دوران بتایا ہے کہ وہ مختلف آؤٹ لیٹس سے بات چیت کر کے اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ ۲۰۲۰ء تک امریکا کا تجارتی خسارہ ۲۰۰؍ارب ڈالر تک آجائے۔ ٹرمپ انتظامیہ چاہتی ہے کہ چینی حکومت اپنے ہاں صنعتی اور تجارتی اداروں کو مختلف مدوں میں دی جانے والی اعانت ختم کردے تاکہ انہیں تجارتی معاملات میں برتری حاصل کرنے کا موقع نہ ملے۔ ایک مدت سے چینی ادارے امریکا میں ہائی ٹیک سیکٹر کی فرمز کو خریدتے آئے ہیں جبکہ امریکی اداروں کو اس نوعیت کی سرمایا کاری سے روکا جاتا رہا ہے۔ ٹرمپ انتظامیہ اب چینی اداروں کی اس نوعیت کی سرمایا کاری کی راہ میں بھی دیواریں کھڑی کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ نیویارک ٹائمز نے مارچ میں لکھا تھا کہ چینی اداروں کو امریکا میں حساس ٹیکنالوجی (مائیکروچپس، فائیو جی وائرلیس ٹیکنالوجی) وغیرہ میں سے متعلق اداروں کو خریدنے سے روکنے کی کوشش کی جائے گی۔

چین سے معاشی تعلقات کے حوالے سے توازن پیدا کرنے کے لیے ٹرمپ انتظامیہ نے چین کی بنائی ہوئی واشنگ مشینیں اور سولر انرجی آلات پر اینٹی ڈمپنگ ڈیوٹیز لگائی ہیں جبکہ اسٹیل اور المونیم کی مصنوعات پر اضافی ٹیکس لگائے گئے ہیں۔ یہ سب کچھ قومی سلامتی کے نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔ ٹرمپ انتظامیہ نے اپریل میں ۵۰؍ارب ڈالر مالیت کی ۱۳۰۰؍اقسام کی چینی مصنوعات پر اضافی درآمدی ڈیوٹی لگائی تھی۔ یہ کئی عشروں کے دوران چین کے لیے برآمدات کے حوالے سے بہت بڑا چیلنج تھا۔ چین نے یہ پیشکش کی کہ اگر ٹرمپ انتظامیہ اضافی ڈیوٹی نہ لگائے تو وہ ۷۰؍ارب ڈالر مالیت کی امریکی مصنوعات خریدنے کو تیار ہے۔ چین نے مئی میں غیر ملکی آٹو موبائلز (گاڑیوں) پر درآمدی ڈیوٹی ۲۵ فیصد سے گھٹا کر ۱۵ فیصد کردی جبکہ امریکا میں یہ ڈیوٹی اب بھی ڈھائی فیصد تک ہے۔

صدر ٹرمپ نے واضح کردیا ہے کہ امریکا درآمدی ڈیوٹی میں جو اضافہ کر رہا ہے اُس سے حلیف بھی مستثنیٰ نہیں۔ مئی ۲۰۱۸ء کے آخر میں امریکا نے کینیڈا، میکسیکو اور یورپی یونین سے منگوائی جانے والی اسٹیل کی مصنوعات پر ۲۵ فیصد اور المونیم کی مصنوعات پر ۱۰ فیصد ڈیوٹی عائد کردی۔ یہ اقدام قومی سلامتی کے نقطۂ نظر سے کیا گیا کیونکہ ٹرمپ انتظامیہ نے محکمۂ تجارت کے حوالے سے یہ تجزیہ پیش کیا کہ اسٹیل اور المونیم کی مصنوعات درآمد کرنے سے ملک کی تجارتی بنیاد کمزور پڑتی ہے۔ کینیڈا نے اس حوالے سے شدید ردعمل ظاہر کیا۔ امریکا کے سوا جی سیون کے تمام ارکان نے بھی اس اقدام کی مذمت کرتے ہوئے خاصا شدید بیان جاری کیا۔

صدر ٹرمپ کے اقدامات سے عالمی سطح پر ردعمل پیدا ہوا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ محض حقیقت پسندی کا مظہر ہے۔ سیاسی تجزیہ کار جوناتھن کرشنر کا کہنا ہے کہ آج کی دنیا میں ہر ملک کو اپنی تجارتی اور صنعتی بنیاد مضبوط بنائے رکھنے پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ امن کے زمانے میں معاشی معاملات اچھی طرح چل رہے ہوتے ہیں، مگر اس کے نتیجے میں بعض ممالک صورتِ حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تجارت اور ادائیگیوں کے توازن کو اِس بری طرح اپنے حق میں کرلیتے ہیں کہ بہت سے ممالک کے لیے پنپنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ جو ممالک تجارت کے معاملے میں عالمگیریت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، وہ غیر معمولی حد تک ہدف پذیر رہتے ہیں یعنی کسی بھی وقت کسی بُری صورتِ حال کا شکار ہوسکتے ہیں۔ انتخابی مہم کے سلسلے میں ایک خطاب کے دوران ڈونلڈ ٹرمپ نے کہا تھا کہ امریکا کے دوست اور دشمن دونوں ہی اپنے قومی مفادات کو ہر حال میں ترجیح دیتے ہیں، اس لیے اب امریکا کو بھی ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ مزید یہ کہ ہم اب اپنے ملک اور عوام کو عالمگیریت کی دُھن پر مزید رقص کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ٹرمپ کا موقف تھا کہ ہر ملک کو سب سے پہلے اپنے مفادات پر نظر رکھنی چاہیے۔ دوستی کے معاملے میں بھی اپنے مفادات کسی طور داؤ پر نہیں لگائے جاسکتے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ امریکا اب ہمہ جہتی نوعیت کے اقدامات اور معاہدوں سے دور ہونا چاہتا ہے۔ ٹرمپ انتظامیہ کہتی ہے کہ اگر امریکا کو کسی ملک کے ساتھ مل کر کچھ کرنا بھی پڑے تو وہ دوطرفہ بنیاد پر ہو۔ ایران سے جوہری معاہدے، پیرس کے معاہدۂ ماحول اور دیگر بہت سے معاملات میں امریکا نے دوطرفہ امور کی بات کی ہے۔ اس نے اقوام متحدہ کے لیے فنڈنگ میں ۴۰ فیصد کٹوتی کے ساتھ ساتھ بنیادی حقوق اور ثقافت سے متعلق اقوام متحدہ کے اداروں سے الگ ہونے کا بھی عندیہ دیا ہے۔ علاوہ ازیں تارکین وطن کے معاملے پر بات چیت بند کردی گئی ہے۔ صدر ٹرمپ نے شمالی امریکا کے معاہدۂ آزاد تجارت کو ختم کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے کہا ہے کہ امریکا اب میکسیکو اور کینیڈا سے دوطرفہ بنیاد پر تجارتی معاملات طے کرسکتا ہے۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے کثیر الجہتی اور کثیر القومی معاہدوں، سمجھوتوں اور اداروں کے حوالے سے شدید تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس نوعیت کے سیٹ اپ میں کمزور ممالک کے لیے غیر معمولی مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں بھی شدید مشکلات محسوس کرتے ہیں۔ ایسے میں بہتر یہی ہے کہ بیشتر معاملات دوطرفہ بنیاد پر طے کیے جائیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد جو عالمی نظام وضع کیا گیا اس میں سب کچھ امریکی طاقت پر منحصر تھا۔ یہ نظام اب تک روبہ عمل ہے، مگر اب بہت کچھ تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ امریکا پر دباؤ زیادہ ہے۔ اب تک کی امریکی حکومتیں اس حوالے سے کھل کر بات کرنے سے گریزاں رہی ہیں۔ عالمی نظام کو مضبوط رکھنے کے لیے امریکا نے بہت کچھ جھیلا ہے، بالخصوص کینیڈا، میکسیکو، یورپ اور جاپان کی سلامتی یقینی بنانے کے حوالے سے۔ اب وقت آگیا ہے کہ امریکا ایک نئے عالمی نظام کی راہ ہموار کرے، جس میں سب کچھ اس کی طاقت پر منحصر نہ ہو۔ ایسی کسی بھی صورت میں دوسرے بہت سے طاقتور ممالک محض مزے کرتے رہیں گے اور بوجھ امریکا کو اٹھانا پڑے گا۔

امریکا اب مفت کی مزید سیر کرانے کو تیار نہیں۔ متعدد ممالک نے امریکی پالیسیوں کے نتیجے میں خرابیاں جھیلی ہیں مگر چند ایک ممالک نے اتحادی ہونے کے ناطے فوائد بھی تو بٹورے ہیں۔ معاہدۂ شمالی بحر اوقیانوس کی تنظیم (نیٹو) کے ارکان کی تعداد ۲۹ ہے۔ اس تنظیم کے مجموعی بجٹ کا کم و بیش ۷۳ فیصد امریکا کی طرف سے آتا ہے۔ یہ تنظیم بنیادی طور پر یورپ کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ اب امریکی

پالیسی ساز اس نکتے پر زور دے رہے ہیں کہ نیٹو کو چلانے اور اتحادیوں کو تحفظ فراہم کرنے کا سارا بوجھ امریکا پر ڈالنے کے بجائے تمام اتحادی اپنا اپنا کردار ادا کریں۔

مفت کی سیر کرنے والوں پر تنقید کرنے میں ڈونلڈ ٹرمپ انوکھے نہیں۔ براک اوباما نے ۲۰۱۶ء میں دی اٹلانٹک سے انٹرویو میں کہا تھا ''مفت کی سیر کرنے والوں کو میں بالکل پسند نہیں کرتا۔ مغرب کے تحفظ کی ذمہ داری امریکا نے اٹھا رکھی ہے۔ برطانیہ اور دیگر ممالک اپنا کردار ادا نہیں کر رہے۔ اگر برطانیہ نے دفاع کے لیے اپنی مجموعی قومی پیداوار کا ۲ فیصد مختص نہ کیا تو امریکا کے لیے اس معاملے میں اس کا ساتھ دینا انتہائی دشوار ہو جائے گا''۔

مفت کی سیر کرنے کے خلاف جذبات تو سرد جنگ کے زمانے میں بھی پائے جاتے تھے، مگر تب چونکہ سوویت یونین کی شکل میں امریکا اور یورپ دونوں کے لیے ایک بہت بڑا اور واضح دشمن موجود تھا اس لیے امریکی پالیسی ساز اس حوالے سے کچھ زیادہ بولنے کی پوزیشن میں نہ تھے اور انہیں اندازہ تھا کہ زیادہ بولنے سے معاملات بگڑیں گے۔ اتحادیوں کو بھی معلوم تھا کہ جب تک سوویت یونین ہے، امریکا پورے مغرب کے دفاع کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے میں کافی نہیں رہے گا۔ مگر اب تو وہ خطرہ جا چکا ہے۔ سوویت یونین کی تحلیل کو تین عشرے مکمل ہونے والے ہیں۔ ایسے میں امریکا کے لیے پالیسیاں تبدیل کرنا ناگزیر ہو چکا ہے۔ امریکی صدور مفت کی سیر کرنے والوں کے خلاف بولتے آئے ہیں مگر حالات کی بدلتی ہوئی روش انہیں عملی سطح پر کچھ کرنے سے روکتی رہی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ پالیسیاں تبدیل کر لی جائیں۔

سیاسی و دفاعی امور کے تجزیہ کار بیری پوزن نے اسی جریدے کے لیے ایک تجزیے میں لکھا تھا کہ امیروں کے لیے ویلفیئر کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے دفاعی اخراجات کے حوالے سے اتحادیوں پر جو شدید نکتہ چینی کی ہے اس کے نتائج بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ امریکا کے بیشتر بڑے اتحادیوں نے ۲۰۱۰ء کے بعد دفاعی اخراجات میں سب سے زیادہ اضافہ کیا ہے۔

بلاپ کے نزدیک صدر ٹرمپ اتحادیوں پر دفاعی اخراجات میں اضافے کے حوالے سے دباؤ ڈالنے تک محدود نہیں۔ وہ دراصل نیٹو کو ختم کرنے کے درپے ہیں تاکہ یورپ کے دفاع کا کوئی نیا سیٹ اپ سامنے آئے اور امریکا پر یورپ کے دفاع کی پوری ذمہ داری عائد نہ ہو۔ جون میں ڈیوڈ لیو ہارٹ نے دی نیویارک ٹائمز میں لکھا کہ ''اگر کسی امریکی صدر کو نیٹو کی تحلیل کے لیے کوئی خفیہ منصوبہ تیار کرنے کو کہا جائے تو وہ خفیہ منصوبہ تقریباً ویسا ہی دکھائی دے گا، جیسا موجودہ صدر ٹرمپ کا رویہ ہے''۔ ڈیوڈ لیون ہارٹ نے اپنے تجزیے میں اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ کسی بھی بڑے اتحاد کی موت دراصل مقصد کے حصول میں کامیابی سے حاصل ہوتی ہے۔ نیٹو کو بنیادی طور پر سوویت یونین کا سامنا کرنے کے لیے مصنوعی شہود پر لایا گیا تھا۔ جب سوویت یونین کی تحلیل واقع ہوگئی تو نیٹو کا جواز تخلیق بھی ختم ہو گیا۔ ایسے میں امریکا اور یورپ دونوں کے لیے لازم ہو گیا کہ تبدیل شدہ صورتِ حال میں کچھ ایسا کریں، جو حالات سے مطابقت رکھتا ہو۔

بیسویں صدی کے آخری دو عشروں کے بعد سے دنیا کے معاملات انتہائی تبدیل ہو چکے ہیں۔ طاقتوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ مضبوط ممالک کی تعداد میں اضافے سے اتحادوں کی نوعیت بھی بدل گئی ہے۔ اب وفاداریاں تبدیل کرنے کا عمل تیز ہو گیا ہے۔ وہ دور گیا کہ کوئی کسی کا وفادار ہوتا تھا تو عشروں تک معاملات تبدیل ہی نہیں ہوتے تھے۔ اب تو چند ہی برس میں کوئی کہیں دکھائی دیتا ہے اور کوئی کہیں۔ سابق امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے کہا تھا ''امریکا کا کوئی مستقل دوست ہے نہ دشمن۔ صرف مستقل مفادات ہیں''۔ فی زمانہ بیشتر ریاستیں عملی سیاست کا یہ طریق اختیار کیے ہوئے ہیں۔ حالات کے بدلتے ہی دوست اور دشمن بھی بدل جاتے ہیں۔

صدر ٹرمپ نے روس کے معاملے میں غیر معمولی حقیقت پسندانہ پالیسی اختیار کی ہے۔ انہوں نے بھی سابق امریکی صدور کی طرح روس سے براہِ راست تصادم کی راہ مسدود کرنے پر توجہ دی ہے۔ ایران اور شام کے معاملے میں دونوں ممالک کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ سلامتی اور تعاون کے معاملے میں قریب آنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ جو لوگ صدر ٹرمپ کو روس کی کٹھ پتلی قرار دینے کی کوشش کرتے آئے ہیں، انہوں نے ہی کم و بیش ربع صدی تک روس سے تعلقات کو نہایت بھونڈے انداز سے برتا اور خرابیوں کی راہ ہموار کی۔

قصہ مختصر، جو کچھ ڈونلڈ ٹرمپ چاہتے ہیں وہ محض اُن کی خواہش نہیں بلکہ حالات کا تقاضا بھی ہے۔ نیٹو ارکان کے درمیان تعلقات کی نوعیت تبدیل اور کمزور ہو رہی ہے۔ یہ سب کچھ سوویت یونین کی تحلیل کے بعد سے ہوا ہے۔ سیاسی تجزیہ کار جان اکنبری کے الفاظ میں کہیے تو یوں ہے کہ سرد جنگ کے دور میں امریکا کو اتحادی درکار تھے اور اتحادیوں کو امریکا۔ ایسے میں مل کر کام کرنے کی بھرپور گنجائش موجود تھی۔ اب معاملہ یہ نہیں رہا۔ سوویت یونین کی تحلیل کے ساتھ مشترکہ اور بڑا دشمن ختم ہو گیا۔ ایسے میں دفاعی تعلقات کی نوعیت بھی تبدیل ہوگئی۔ سوویت یونین کی موجودگی میں اتحادیوں کو امریکا کی زیادہ ضرورت تھی۔ وہ دفاع کے حوالے سے امریکا پر انحصار پذیر تھے۔ اب ان اتحادیوں کو کسی بہت بڑے خطرے کا سامنا نہیں، اس لیے وہ امریکا کی زیادہ ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔

۱۹۹۳ء میں بین الاقوامی تعلقات کے حقیقت پسند مفکر اور تجزیہ کار کینتھ والٹز نے کہا تھا ''سوویت یونین نے نیٹو کے قیام کی راہ ہموار کی۔ سوویت یونین کی موت سے یورپ کو آزادی نصیب ہوئی۔ آزادی کے ساتھ خود انحصاری بھی آتی ہے۔ جلد یا بدیر امریکا کے اتحادی اپنے معاملات خود ہی چلانے کے قابل ہو جائیں گے اور تب انہیں امریکا کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں ہوگی''۔

خیر، اب ایسا بھی نہیں ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کی ہر پالیسی بہتر رہی ہے۔ انہوں نے افغانستان میں لڑی جانے والی جنگ کو وقت اور وسائل کا ضیاع قرار دے کر جان چھڑانے کی کوشش کی، مگر ان کے مشیروں نے مشورہ دیا کہ ایسا کرنا کسی بھی طرح درست نہ ہوگا کیونکہ امریکی افواج کو بے ہنگم طریقے سے نکالنا افغانستان کو داعش اور دیگر انتہا پسند گروہوں کے حوالے کرنے کے مترادف ہوگا۔ اور یہ بات ٹرمپ نے مانی ہے۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں ٹرمپ کو کچھ باک نہیں کہ انٹرنیشنل لبرل آرڈر کمزور پڑ چکا ہے، بیمار ہے۔ مشہور کالم نگار مارٹن وولف کے الفاظ میں کہیے تو اب مغرب کو بھی اندازہ ہے کہ سیکورٹی سیٹ اپ کے اعتبار سے اس کی اہمیت اور مطابقت بہت کم رہ گئی ہے۔ سوویت یونین کی تحلیل نے سب کچھ بدل ڈالا ہے۔ ڈھائی تین عشروں کے دوران بہت سے معاملات کھل کر سامنے آ گئے ہیں اور اب جامع تبدیلی کا راستہ کوئی بھی طاقت نہیں روک سکتی۔ کل تک یہ سمجھا جا رہا تھا کہ عالمگیریت سے صرف فوائد حاصل ہوں گے۔ اب ماہرین یہ کہہ رہے ہیں کہ سستی اشیا امریکی منڈیوں تک پہنچانے اور بہت سی نوکریاں بیرون ملک منتقل کرنے سے امریکا میں ایک طرف تو بے روزگاری بڑھی ہے اور دوسری طرف بہت سے مینوفیکچرنگ ادارے شدید خسارے سے

باقی صفحہ نمبر ۴

پھر وہی مندر کی سیاست

سگر نیل سنہا

(بھارت کی حکمراں جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی نے ایک بار پھر مندر کی سیاست شروع کر دی ہے۔ ۲۰۱۹ء میں عام انتخابات ہونے ہیں۔ اس سے قبل بی جے پی چاہتی ہے کہ عام ہندوؤں کے جذبات کو اپیل کرنے والی باتیں کر کے ووٹ بینک کو کسی نہ کسی طور برقرار رکھا جائے۔ بھارت میں ہندوؤں کی اکثریت کو مختلف نعروں کے ذریعے ایک طرف دھکیلا جاتا رہا ہے۔ جن اہم معاملات کو بنیاد بنا کر عوام کو بے وقوف بنایا جاتا رہا ہے، اُن میں رام جنم بھومی مندر کی تعمیر کا معاملہ بھی نمایاں ہے۔)

.....

اتر پردیش کے شہر ایودھیا میں منعقد کی جانے والی ایک ریلی میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ ایودھیا میں جہاں بابری مسجد ہوا کرتی تھی وہاں رام جنم بھومی مندر تعمیر کرنے کے حوالے سے خصوصی آرڈیننس جاری کیا جائے۔ ایسا لگتا ہے کہ بی جے پی کی قیادت میں اقتدار کے ساڑھے چار سال مکمل کرنے والی حکومت کو اب تسلسل سے ہم کنار رہنے کے حوالے سے حزب اختلاف کے ہاتھوں شدید مشکلات کا سامنا ہے۔ بی جے پی محسوس کرتی ہے کہ آئندہ سال کے عام انتخابات میں بھرپور کامیابی حاصل کرنا آسان نہ ہوگا۔

ایندھن کی بڑھتی ہوئی قیمتیں، روزگار کے مواقع کی کمی، کسانوں میں پایا جانے والا شدید اضطراب اور معاشرے میں ذات پات کی بنیاد پر موجود تقسیم کے حوالے سے شدید انتشار ..... یہ سب مل کر بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیے مشکلات میں اضافہ کر رہے ہیں۔

۲۰۱۴ء کے عام انتخابات میں عوام نے کانگریس کی قیادت میں یونائیٹڈ پروگریسیو الائنس کی حکومت کی کارکردگی سے مایوس ہو کر بی جے پی کو مینڈیٹ سے نوازا تھا۔ بی جے پی کی قیادت نے عوام کو یقین دلایا تھا کہ معاملات کو درست کیا جائے گا، اچھے دن یقینی بنائے جائیں گے۔ بہرکیف، اب یہ بالکل واضح ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی ایک بار پھر منتخب ہونے کے لیے رام جی کا سہارا لے رہی ہے۔ بات پھر مندر کی سیاست تک آ گئی ہے۔

انتہا پسندی کی سوچ کے ساتھ سیاست کرنے والی بھارتیہ جنتا پارٹی نے اب سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کا سہارا لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ سپریم کورٹ کہتی ہے کہ وہ یہ طے کرے گی کہ کون سا بینچ کب رام جنم بھومی مندر کی تعمیر کے کیس کی سماعت کرے گا۔ جنوری میں سماعت کا امکان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ عام انتخابات سے قبل رام جنم بھومی مندر کی تعمیر سے متعلق کیس کا حتمی فیصلہ متوقع نہیں۔

۲۰۱۴ء کے بعد سے اب تک بھارتیہ جنتا پارٹی کو ضمنی انتخابات میں شکست کا سامنا رہا ہے۔ حال ہی میں جنوبی ریاست کرناٹک کے ضمنی انتخابات میں بی جے پی کو غیر معمولی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ اب پارٹی میں اس حوالے سے شدید اضطراب پایا جاتا ہے۔ یہ خیال کھل کر ظاہر کیا جا رہا ہے کہ عام انتخابات میں غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور اس حوالے سے ابھی سے تیاری کرنا پڑے گی۔ بی جے پی نے پہلے بھی رام مندر کی سیاست کے کاندھے پر سوار ہو کر اقتدار کے ایوان تک سفر کیا تھا۔ اب ایسا لگتا ہے کہ پارٹی پھر مندر کی سیاست کو گلے لگانے کی تیاری کر رہی ہے۔ چار پانچ سال کے دوران بھارت میں ہندو انتہا پسندی کی لہر رہی ہے۔ بی جے پی نے بظاہر پوری تیاری کر لی ہے کہ رام جنم بھومی مندر کے ایشو کو آئندہ عام انتخابات تک بھرپور توجہ کے ساتھ زندہ رکھا جائے اور عوام کے ذہنوں پر دوبارہ مسلط کیا جائے۔ کانگریس اور دیگر جماعتوں نے رام جنم بھومی مندر کے معاملے میں کھل کر موقف نہیں اپنایا۔ بی جے پی رام مندر ایشو کے معاملے پر دیگر سیاسی جماعتوں کے مبہم اور تذبذب پر مبنی رویے کو اپنی مرضی کے مطابق اپنے مفاد کے لیے بروئے کار لانا چاہتی ہے۔

رام مندر کے مسئلے پر بی جے پی کو مزید مضبوط ہونے کا موقع اس لیے ملا ہے کہ کانگریس نے ہندُتوا کے ایجنڈے پر خاصی نرمی اور کمزوری دکھائی ہے۔ کانگریس کے سربراہ راہول گاندھی کو ''جنیو دھاری'' برہمن کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ بی جے پی نے مذہبی معاملات میں کانگریس کے کمزور موقف سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ کانگریس کو بھارت میں GOP (گرینڈ اولڈ پارٹی) کی حیثیت حاصل ہے۔ بی جے پی اچھی طرح جانتی ہے کہ وہ مذہب کے معاملے پر کھل کر سامنے نہیں آسکتی۔ ہندُتوا کبھی کانگریس کا ایجنڈا نہیں رہا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے ہمیشہ یہ نکتہ ذہن نشین رکھا ہے کہ کانگریس نے اقلیتوں کو ساتھ ملا کر چلنے کی کوشش کی ہے۔ بی جے پی کی طرف سے یہ بات زور دے کر کہی جاتی رہی ہے کہ کانگریس نے ہمیشہ اکثریت یعنی عام ہندوؤں کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے میں تساہل اور تغافل کا مظاہرہ کیا ہے۔ کانگریس نے رام مندر کے انتہائی حساس ایشو پر بھی عام ہندوؤں کے جذبات کو اپیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب بی جے پی اس صورتِ حال کا بھرپور فائدہ اٹھانے کی تیاری کر رہی ہے۔

بی جے پی کے ناقدین اور غیر جانب دار مبصرین کہتے ہیں کہ رام مندر کی سیاست سے بی جے پی کو فائدہ ضرور پہنچے گا مگر بہت زیادہ نہیں، کیونکہ دیہی آبادی کو رام مندر کی تعمیر سے زیادہ اس بات سے غرض ہے کہ پینے کا صاف پانی ملے، صحت کی بنیادی سہولتیں ملیں، تعلیم کا بہتر انتظام ہو، بجلی آئے، ایندھن ملے، سڑکیں تعمیر کی جائیں اور کسانوں کے معاشی مسائل حل کرنے پر خاطر خواہ توجہ دی جائے تاکہ اُن میں خود کشی کا رجحان کمزور پڑے۔

وزیر مملکت برائے صحت و خاندانی بہبود انوپریہ پٹیل نے پارلیمان کے ایوان بالا راجیہ سبھا میں ایک تحریری جواب میں کہا تھا کہ ملک بھر میں بنیادی صحت کے ۶۱٫۲ فیصد مراکز ایسے ہیں، جن میں صرف ایک ڈاکٹر تعینات ہے اور ۷۶۹ مراکز ایسے ہیں، جن میں کوئی ڈاکٹر تعینات نہیں۔ ۲۰۱۷ء کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ دنیا بھر میں غذائی قلت سے دوچار بچوں کی نصف تعداد بھارت سے تعلق رکھتی ہے۔ بھارت صحت کے شعبے پر خام قومی پیداوار کا صرف ایک اعشاریہ دو فیصد خرچ کرتا ہے جو ضرورت سے بہت کم ہے۔

فراہمی و نکاسیٔ آب سے متعلق امور پر کام کرنے والے ادارے ''واٹر ایڈ'' نے ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ بھارت کے دیہی علاقوں میں کم از کم ۶ کروڑ ۳۴ لاکھ افراد پینے کے صاف پانی تک رسائی سے مکمل طور پر محروم ہیں۔ یہ تعداد کسی بھی ملک میں پینے کے صاف پانی تک رسائی سے محروم افراد کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

کسانوں کے خراب حالات بھارت کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۹۸ء سے اب تک ۳ لاکھ سے زائد کسان مالی مشکلات سے تنگ آ کر خودکشی کر چکے ہیں۔ موسمی حالات کی خرابی سے فصل کے بگڑ جانے پر قرضے ادا کرنے کے قابل نہ رہنے والے کسان خودکشی کر لیتے ہیں۔ اس

باقی صفحہ نمبر ۴

حماس کے لیے حمایت کا حصول

احمد ابوعامر

حماس نے مشرق وسطیٰ، افریقا اور دیگر خطوں میں اپنے رہنماؤں کو بھیجنا شروع کیا ہے تاکہ تعلقات بہتر بنا کر ان خطوں بالخصوص یورپی یونین میں تنظیم کے حوالے سے پائے جانے والے منفی تاثر کو زائل کیا جاسکے۔ حماس کے ''چینج اینڈ ریفارم'' پارلیمنٹری بلاک کا ایک وفد ۲۱ نومبر کو ترکی کے شہر استنبول پہنچا۔ وہاں اس وفد نے حماس کے مقامی رہنماؤں سے ملاقات کی اور تنظیمی امور کا جائزہ لیا۔ وفد کی قیادت محمود الظہر نے کی۔ وفد نے حماس کے جن رہنماؤں سے ملاقات کی ان میں مہر صالح بھی شامل تھے۔ اسی وفد کو یکم دسمبر کو جنوبی افریقا بھی جانا تھا۔ حماس کے لیے خیر سگالی کے یہ دورے ناگزیر تھے کیونکہ اس کی سب سے بڑی حریف جماعت فتح فلسطینی قانون ساز کونسل (پی ایل سی) کو تحلیل کرنا چاہتی ہے۔ اس ادارے پر حماس کا کنٹرول ہے۔ ۲۰۰۶ء کے انتخابات میں حماس نے کامیابی حاصل کی تھی اور پی ایل سی پر چھا گئی تھی۔ اگلے ہی سال حماس نے فتح سے راہیں الگ کرتے ہوئے غزہ کی پٹی کو عسکری شکنجے میں کس لیا تھا۔ فلسطینی مقتدرہ کے صدر محمود عباس کا تعلق فتح سے ہے۔ مغربی کنارے اور فلسطین مرکزی کونسل پر محمود عباس کا کنٹرول ہے۔ حماس نے پی ایل سی کے اجلاس باقاعدگی سے منعقد کیے، مگر دوسری طرف محمود عباس نے غرب اردن کے صدر مقام رام اللہ میں کونسل کے دروازے بند کردیے ہیں۔

حماس کے پارلیمانی بلاک کے سربراہ یحییٰ موسیٰ نے المانیٹر کو بتایا کہ حماس کا خیر سگالی وفد ترکی کے علاوہ جنوبی افریقا، ایران، تیونس، لبنان، مراکش اور الجزائر کا بھی دورہ کرے گا۔ ان کے بقول ان تمام یعنی ساتوں ممالک سے دورے کی باضابطہ دعوت موصول ہوئی ہے۔ وفد کے دورے جنوری ۲۰۱۹ء کے وسط میں مکمل ہوں گے۔

ان دوروں کا مقصد عالمی برادری اور بالخصوص خطے کے ممالک کو محصور غزہ کی پٹی، غرب اردن اور مقبوضہ بیت المقدس میں فلسطینیوں کی مشکلات سے آگاہ کرنا اور فلسطینی کاز کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ حمایت حاصل کرنا ہے۔ یحییٰ موسیٰ کہتے ہیں کہ اسرائیل کی جانب سے غزہ کی پٹی کی ناکہ بندی اور اس کے رفاہ بارڈر کی راہداری بند کرنے کے اقدام سے کئی سال تک حماس کے لیے کہیں بھی وفد بھیجنا ممکن نہ رہا۔ اس حقیقت کے تناظر میں موجودہ دورے بہت اہم ہیں۔ حماس کی مشکلات یوں بھی بڑھ گئی تھیں کہ ۲۰۱۳ء میں منتخب صدر محمد مرسی کو فوج کے ہاتھوں ہٹائے جانے کے بعد سے حماس اور مصر کے تعلقات میں کشیدگی در آئی تھی اور پھر ۲۰۱۵ء میں مصر کی کورٹ آف ارجنٹ میٹرز نے حماس کو دہشت گرد تنظیم قرار دے دیا تھا۔ چار ماہ بعد ایک اپیل کورٹ نے اس فیصلے کو غلط قرار دیا تب کہیں حماس کے لیے مصر میں دوبارہ داخل ہونا ممکن ہوسکا۔

حماس نے ۲۰۰۶ء میں عام انتخابات میں بھرپور کامیابی حاصل کی اور فلسطین قانون ساز کونسل میں مضبوط ترین جماعت بن کر ابھری مگر چونکہ حماس کو یورپی یونین، امریکا اور دیگر ترقی یافتہ ممالک نے دہشت گرد تنظیم قرار دے رکھا ہے، اس لیے کسی بھی عالمی پارلیمانی فورم میں پی ایل سی کو فلسطینیوں کی نمائندگی کا حق حاصل نہیں۔ تمام بڑے عالمی پارلیمانی پلیٹ فارمز میں شرکت کے دعوت نامے فلسطینی قومی کونسل کو بھیجے جاتے ہیں، جو غرب اردن، غزہ کی پٹی اور باقی دنیا میں مقیم فلسطینیوں کا سب سے بڑا نمائندہ ادارہ ہے۔ فلسطینی قومی کونسل دنیا بھر میں وفود بھیجتی ہے، تاہم اِن میں حماس کے ارکان شامل نہیں کیے جاتے۔

فتح سے تعلق رکھنے والے پی ایل سی کے رکن اور فلسطینی قومی کونسل کے بھی رکن ولید اصاف کہتے ہیں کہ سات ممالک کے دورے کرنے والے فلسطینی وفد میں حماس سے تعلق رکھنے والے افراد کو پی ایل سی کے ارکان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کی اپنی ذاتی یعنی حماس کے ارکان کی حیثیت میں شامل کیا گیا ہے۔ ولید اصاف نے ساتوں ممالک کے قانون ساز اداروں پر زور دیا ہے کہ وہ پارلیمانی معاملات پر حماس کے بجائے فلسطینی قومی کونسل سے براہِ راست بات کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ عالمی پارلیمانی یونین، عرب انٹر پارلیمنٹری یونین اور افریقی پارلیمانی یونین نے کم و بیش ۱۱ سال سے تنظیم آزادیٔ فلسطین کو فلسطینیوں کی نمائندہ تنظیم مان کر اُس سے بات چیت کی ہے۔

قانونی امور کے ماہر اور فلسطین کے سینٹر فار پالیسی ریسرچ اینڈ اسٹریٹجک اسٹڈیز کے ڈائریکٹر برائے غزہ صلاح عبدالعطی کہتے ہیں کہ عالمی سطح پر تعلقات بہتر بنانے کے حوالے سے حماس کے ارکان کے یہ دورے بہت اہم ہیں۔ امید ہے کہ ان دوروں سے فلسطین کے نیشنل پروجیکٹ اور فلسطینی کاز کے لیے عالمی سطح پر حمایت کا حصول یقینی بنانے میں خاطر خواہ حد تک مدد ملے گی۔

صلاح عبدالعطی نے حماس اور فتح پر زور دیا ہے کہ وہ الگ الگ رہتے ہوئے کچھ کرنے کے بجائے مل کر کام کریں تاکہ عالمی سطح پر فلسطینی کاز کے لیے زیادہ سے زیادہ حمایت کا حصول یقینی بنایا جاسکے۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ دونوں دھڑے اپنے اپنے زیر اثر علاقوں میں اپنے طور پر قوانین وضع اور نافذ کرتے ہیں۔ صلاح عبدالعطی کہتے ہیں کہ اس سے فلسطینی کاز کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔

سیاسی تجزیہ کار شہرا بی الغریب نے المانیٹر سے گفتگو میں کہا کہ حماس کے ان دوروں سے فلسطینی کاز کی طرف عالمی برادری کی توجہ مبذول کرانے میں مدد ملے گی۔ یہ دورے اس اعتبار سے بھی اہم ہیں کہ اسرائیلی قیادت اس وقت اومان، اردن اور متحدہ عرب امارات سے سفارتی سطح پر تعلقات بہتر بنانے کے حوالے سے خاصی متحرک ہے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Hamas politicos make rounds internationally to gain backing".
("al-monitor.com". November 30, 2018)

بقیہ: روس: خفیہ اداروں کے درمیان کشمکش

راست تعلق رکھنے والے میڈیا کے قیام کے ساتھ انٹرنیٹ اور انفارمیشن ایجنسیز کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ روس کی کوشش ہوگی کہ سیاسی اور سماجی طاقتوں کے ساتھ مل کر طاقتور اشرافیہ اور جمہوری اداروں کے خلاف بداعتمادی کو بڑھایا جائے۔ کریملین انفارمیشن کی جنگ کے دوران آزادی اظہار رائے کو بھی استعمال کرے گا، جو جمہوریت میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ روس پہلے بھی ''ہائبرڈ'' مداخلت (غیر روایتی جنگ) کرتا رہا ہے۔

بدقسمتی سے معلومات کی جنگ دنیا بھر میں پھیل چکی ہے، اب تو اس جنگ میں بہت زیادہ تیزی آچکی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ روس اپنی خفیہ ایجنسیوں کی غلطیوں کو پس پشت ڈال کر ان کے درمیان تناؤ کی کیفیت کا خاتمہ کرے۔

(ترجمہ: سید طالوت اختر)

"From information war to intelligence agency battles". ("ecfr.eu". Nov.2, 2018)

سعودی عرب پر امریکا کی کمزور گرفت

Madawi al-Rasheed

جمال خاشقجی کے قتل کی وجہ سے دنیا بھر میں سعودی عرب کی مقبولیت کا گراف تیزی سے نیچے کی طرف آیا ہے۔ سعودی عرب کے دوست ممالک جیسے فرانس، جرمنی، برطانیہ وغیرہ ہر لمحے سعودی ریاست کے حق میں بات کرتے تھے لیکن خاشقجی کے قتل کے بعد کھل کر سعودی عرب پر تنقید کر رہے ہیں اور اس بے رحمانہ قتل کے لیے صاف شفاف تحقیقات کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ سعودی عرب کے لیے اپنے حریف کو حراست میں رکھنا یا اسے راستے سے ہٹانا نیا نہیں ہے اور اس حوالے سے ہونے والی تنقید بھی سعودی ریاست کے لیے نئی نہیں ہے لیکن بے رحمانہ طریقے سے خاشقجی کا قتل سعودی ریاست کی حد سے بڑھتی ہوئی سفاکی کو ظاہر کر رہا ہے۔

ماضی میں صورت حال قدرے بہتر تھی، سعودی بادشاہ اپنے خاندان کے دوسرے شہزادوں کو حکومتی معاملات میں شریک کرتے تھے اور بادشاہ حکومت میں شریک ان شہزادوں کے سامنے جواب دہ ہوتا تھا لیکن شاہ سلمان نے ۲۰۱۵ میں حکومت میں آنے کے بعد سے شاہی خاندانی مشاورت کا سلسلہ بھی ختم کر دیا اور سارے معاملات کی باگ دوڑ اس طرح محمد بن سلمان کے ہاتھ میں دے دی جس طرح کے ایک مطلق العنان بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ سعودی حکومت شاہی خاندان کے مشاورتی نظام سے نکل کر ایک ایسے نظام میں تبدیل ہوگئی جہاں اقتدار کی تمام تر طاقت فرد واحد کے ہاتھ میں ہے۔

خاشقجی کا قتل یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس بار سعودی حکومت نے طاقت کے استعمال میں تمام حدود پار کر لی ہیں، یہ واقعہ سعودی عرب کے اتحادیوں کے لیے ایک تنبیہ اور خصوصا امریکا کو خبردار کرنے کے لیے کافی ہے، اس واقعہ نے سعودی شاہی خاندان اور سعودی عوام کو تنہا کر دیا ہے۔ امریکا وہ واحد اتحادی ہے، جو سعودی حکومت پر اثر انداز ہو سکتا ہے اور اس کام کے لیے امریکا کو سعودی عرب کے ساتھ اپنی خارجہ پالیسی از سر نو ترتیب دینا ہوگی لیکن ٹرمپ کے دیے گئے حالیہ بیان میں اس حوالے سے کوئی سنجیدگی نہیں ہے۔

مطلق العنان حکمرانی کا دور

اس قتل کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس نے برسوں سے چلتی سعودی شاہی خاندان کی جانشینی پر ایک سوالیہ نشان بنا دیا ہے، پہلے سعودی حکومت میں بادشاہ گرچہ ایک ہی ہوتا تھا لیکن کچھ قوانین کے تحت تجربہ کار شہزادوں کو بھی حکومتی امور میں شامل کیا جاتا تھا، اس دوران شہزادوں کے درمیان کچھ معاملات میں اختلاف بھی سامنے آتے لیکن انہی شہزادوں کی وجہ سے بادشاہ وقت پر ایک اخلاقی دباؤ برقرار رہتا تھا اور فیصلے سب کی مشاورت سے ہی طے پاتے تھے اور آل سعود کے درمیان ایک توازن قائم تھا۔

حکومتی معاملات میں شاہی خاندان سے مشاورت کا عمل شاہ عبداللہ کے دورِ حکومت تک رہا، جیسے کے پہلے نظام حکومت چلتا رہا لیکن محمد بن سلمان نے یہ اصول بدل دیا، ان کی نظر میں نظام حکومت چلانے کے لیے وہ اپنے بڑوں کے مشورے کے محتاج نہیں ہیں۔ شاہ عبداللہ وہ پہلے بادشاہ ہیں جنہوں نے مستقبل کے دو بادشاہوں کی موت اپنے سامنے دیکھی، ایک شہزادہ سلطان جو ۲۰۱۱ء میں انتقال کر گئے دوسرے شہزادہ نائف جو ۲۰۱۲ میں اس دنیا سے رخصت ہوئے، جب یہ دونوں شہزادے بیمار تھے اس وقت شاہ عبداللہ نے اس خلا کو پر کرنے کے لیے نائب بادشاہ کے لیے ایک اضافی عہدے کا اعلان کیا اور انہوں نے اس عہدے کے لیے اپنے سوتیلے بھائی شہزادہ سلمان کو منتخب کیا، ۲۰۱۵ء میں شاہ عبداللہ کی وفات کے بعد شہزادہ سلمان بادشاہ بن گئے۔ شاہ عبداللہ نے ۳۵ شہزادوں پر مشتمل ایک کمیشن اس لیے بنایا تھا کہ مستقبل قریب کے بادشاہ کے مرنے کی صورت میں وہ کمیشن بادشاہ کا انتخاب کرے گا۔

شاہی خاندان کے با اثر شخصیات کی رحلت کی وجہ سے شاہ سلمان شاہی خاندانی مشاورتی شراکت داری توڑنے میں کامیاب رہے، شاہ سلمان اس وقت اقتدار میں آئے جب زیادہ تر شہزادوں کا انتقال ہو چکا تھا اور اسی وجہ سے وہ شاہ عبداللہ کے بھائیوں اور بھتیجوں کو اقتدار سے دور رکھنے میں کامیاب رہے۔ شہزادہ احمد شاہ عبداللہ کے بھائی ہیں اور وہ بھی بادشاہ بننے کے لیے نامزد تھے لیکن وہ ہمیشہ اقتدار سے دور رہے اور کبھی کسی حکومتی عہدے پر نہیں رہے، ان کی سیاست سے اسی کنارہ کشی کی وجہ سے شاہ سلمان شاہ عبداللہ کے پورے خاندان کو بادشاہت سے دور رکھنا چاہتے ہیں اور اب وہ صرف اپنے بھائیوں کو اقتدار میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ شاہ سلمان نے بادشاہ بنتے ہی دو ماہ کے اندر بادشاہی کے لیے نامزد دو شہزادوں شہزادہ مقرب اور شہزادہ محمد بن نائف کو برطرف کر دیا، انہوں نے ۲۰۱۷ میں نائب بادشاہ کا عہدہ بھی ختم کر دیا اور شاہی خاندانی مشاورتی کمیشن کو بھی نظر انداز کر دیا، یہ تمام اقدامات یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ اب صرف اپنے بیٹے محمد بن سلمان کو اقتدار میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

محمد بن سلمان کم عمری سے ہی حکومتی عہدوں پر فائز رہے ہیں، وہ اس وقت بادشاہت کے لیے نامزد ہونے کے علاوہ نائب وزیر اعظم۔ وزیر دفاع۔ معاشی ترقیاتی کونسل کے چیئرمین اور سلامتی و سیاسی کونسل کے چیئرمین بھی ہیں۔ محمد بن سلمان آرمکو (تیل، گیس کمپنی) کے سربراہ بھی ہیں۔ محمد بن سلمان نے سعودی ریاست کے آلات وتوانائی کے معاملات کا اختیار بھی اپنے پاس رکھا ہے، سعودی عرب اس قوت ایک ایسی ریاست میں تبدیل ہو رہا ہے جہاں فیصلے کا اختیار صرف اور صرف ایک ہی فرد کے گرد گھومتا ہے۔

محمد بن سلمان نے وہ سارے چینل بند کر دیے، جن کے ذریعے سعودی عوام اور شاہی خاندان پالیسی پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔ شاہی خاندان کے کمیشن کے افراد پر بدعنوانی کا الزام لگا کر انہی برطرف کر دیا گیا۔ ۲۰۱۷ء میں شاہی اسمبلی کا سلسلہ بھی بند کر دیا گیا، مذہبی امور چلانے والوں کو بھی کنارے لگایا گیا اور تنقید کرنے والی اشرافیہ کو قید کر دیا گیا۔

نامزد بادشاہ محمد بن سلمان نے بغیر کسی مشاورت کے پالیسی جاری کر دی، انہوں نے اپنے عوام کو بحث مباحثہ یا تنقید کا موقع بھی نہیں دیا، خواتین کی ڈرائیونگ سے پابندی اٹھالی، پاپ کلچر کو فروغ دیا، انہوں اپنے اقدامات کے ذریعے ایسا ظاہر کیا کہ بس یہ چند اصلاحات ہی ضروری ہیں اور انہی اصلاحات کو سیاسی اصلاحات کا متبادل بنا کر پیش کیا گیا، یہ اصلاحات اس طرح ڈیزائن کی گئیں کہ ان کی وجہ سے سعودی عوام ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھا سکیں، تنقید کرنے والی آوازوں کو خاموش کیا جا سکے اور سعودی عوام اس موضوع پر بحث نہ کر سکیں، شاہی خاندان کو بھی ان کے حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ سعودی عرب کا نیا مقتدرانہ نظام محمد بن سلمان سے مکمل وفاداری کا مطالبہ کرتا ہے۔ انہی حالات کی نوعیت اور وجوہات کی بنا پر خاشقجی کے قتل پر دنیا بھر سے شدید تنقید کی جا رہی ہے۔

سعودی شاہزادے اور عالمی صدور

شاہی خاندان میں کسی کے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ محمد بن سلمان کو من مانے فیصلوں پر روک سکے، البتہ دوسرے ممالک ممکن ہے کہ انہیں حد میں رہنے پر مجبور کر سکیں اور اس میں امریکا سرفہرست ہے، جو سعودی عرب پر دباؤ ڈال سکتا ہے اور اس حوالے سے ضمانت بھی صرف وہی دے سکتا ہے۔ امریکا کسی بھی مغربی ملک سے زیادہ اسلحہ سعودی عرب کو فروخت کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ سعودی عرب کا اسٹریٹجک پارٹنر بھی ہے، دہشت گردی کے خلاف فلسطین اور اسرائیل کے درمیان جنگ میں بھی سعودی عرب امریکا کا اہم اتحادی ہے اور مشرق وسطی میں ایران کا اثر و رسوخ کم کرنے میں مددگار بھی ہے۔

بدقسمتی سے سعودی عرب اور امریکا کے تعلقات سفارتی سطح پر اتنے پائیدار نہیں ہیں جتنے ان رہنماؤں کے ذاتی تعلقات مضبوط ہیں، انہی ذاتی تعلقات کو بروئے کار لاتے ہوئے امریکا اور سعودی عرب کے درمیان پائیدار سفارتی تعلقات بنائے جاسکتے ہیں۔

سعودی شاہ اور امریکی صدر کے درمیان ۱۹۴۵ء میں کافی اچھے تعلقات رہے ہیں، جب امریکا کے صدر فریکلن ڈی روز ویلٹ نے سوئز کینال میں سعودی شاہ شاہ عبدالعزیز ابن سعود سے ملاقات کی، اسی ملاقات کی وجہ سے سعودی عرب میں پہلا ملٹری بیس تیار ہوا، سعودی عرب میں امریکا کی تیل کمپنیوں کی دلچسپی ۱۹۳۳ء برقرار تھی اور اسی وجہ سے دونوں ملکوں کے تعلقات مستحکم ہوئے اور بعد میں یہی تعلقات امریکی فوجیوں کی ایشیا تک رسائی کا سبب بنے، ان مشترکہ مفادات کی وجہ سے ہی دونوں ممالک کے درمیان سفارت کاری کا آغاز ہوا۔

امریکا کی سعودی عرب کے ساتھ خارجہ پالیسی شروع ہی سے تجارتی بنیادوں پر رہی ہے، شاہی خاندان کے تاجروں کے ساتھ اس کے تعلقات رہے ہیں۔ ۱۹۸۳ء سے ۲۰۰۵ء تک شہزادہ بندر بن سلطان امریکا میں سعودی سفارت کار کے فرائض سرانجام دیتے رہے لیکن نائن الیون کے بعد انہیں واپس بلا لیا گیا، شہزادہ ترکی الفیصل اور عدیل الجبیر نے شہزادہ بندر بن سلطان کو سفارت کار کے طور پر امریکا میں نامزد کیا تھا۔ نائن الیون کے بعد شہزادہ ترکی الفیصل کے علاوہ سعودی کوئی ایسا فرد ڈھونڈنے میں ناکام رہے جو امریکی خواہشات پر پورا اترتے ہوئے دونوں ملکوں کے مذاکرات میں اہم کردار ادا کرے اور شاہی خاندان اور امریکا دونوں کا وفادار بھی ہو۔ نائن الیون کے بعد حالات کو سنبھالنے کے لیے انہیں ہی امریکا بھیجا گیا لیکن وہ امریکا کی پالیسی کے بڑے ناقد تھے مثلاً اسرائیل اور فلسطین کے حوالے سے امریکا کی پالیسی، امریکی پالیسی کے اہم معاملات پر تنقید کی وجہ سے وہ امریکا کو قابل قبول نہیں تھے۔ نائن الیون کے بعد ۱۵ سعودی حملہ آوروں کی نشاندہی کے بعد سعودی عرب کا دفاع کرنا خود سعودی عرب کے لیے مشکل ہوگیا تھا۔

براک اوباما کی صدارت کے دوران شہزادہ ترکی الفیصل عرب بہار میں براک اوباما کی حمایت کے بھی مخالف رہے، ان کا یہ ماننا تھا کہ ایران سیاست اور جمہوریت سے پورے خطے اور خصوصاً سعودی عرب کے لیے بڑا خطرہ ہے۔ یہ حالات اس وقت مزید کشیدہ ہو گئے جب امریکا اور مغربی ریاستوں نے سعودی رضامندی کے بغیر عمان میں ۲۰۱۳ میں ایران کے ساتھ ایٹمی معاہدے پر دستخط کیے۔

محمد بن سلمان نے اقتدار میں آتے ہی اپنے بھائی خالد بن سلمان کو واشنگٹن میں سفیر نامزد کر دیا، جبکہ ایک اور بھائی نے ریاض کی حکومت سنبھال لی۔ دونوں ممالک کے درمیان ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا، اس تقریب میں ٹرمپ کے داماد جیرڈ کشنر اور محمد بن سلمان کے بھائی اس طرح ساتھ ساتھ رہے کہ اس تقریب پر سفارتی سے زیادہ خاندانی تقریب ہونے کا گمان ہوتا رہا۔ بدقسمتی سے اس طرح کے ذاتی تعلقات سفارت کاروں، سفارتی معاملات اور اس کی باریکیوں پر بہت برا اثر ڈالتے ہیں۔

سعودی ریاست کی غیر مستحکم صورت حال، غیر منتخب حکومتی نمائندے، غیر فعال پارلیمان، کنٹرول عدلیہ جیسے معاملات امریکا سے اچھے سفارتی تعلقات کی راہ میں رکاوٹ ہیں، منتخب حکومتی نمائندے، فعال پارلیمان اور آزاد عدلیہ ایک مستحکم ریاست کے ضامن ہوتے ہیں اور فرمانِ شاہی کو متوازن طریقے سے لے کر چلتے ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ امریک نے بھی کبھی سعودی عرب پر ایک جمہوری ریاست بننے کے لیے دباؤ نہیں ڈالا شہزادوں سے صرف اس لیے تعلقات رکھے گئے کہ امریکا یہ جان سکے کہ سعودی عرب کے ساتھ معاملات کیسے رکھے جاتے ہیں، اہم ذمہ داریوں پر موجود ایسے نااہل شہزادوں کی وجہ سے امریکی سعودی سفارتی تعلقات کبھی بھی نارمل سطح پر نہیں رہے، سعودی عرب میں مطلق العنان حکمرانی کے باوجود امریکا محض اسے بدقسمتی یا ترقی میں رکاوٹ قرار دے کر اپنے تعلقات بنائے رکھے گا اور خاشقجی کے قتل کے بعد بھی اس میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

ٹرمپ نے خاشقجی کے قتل کے بعد اس کے قتل کی مذمت کی لیکن محمد بن سلمان کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا۔ ٹرمپ کے بیان کے مطابق کچھ نااہل عناصر ہیں جو سعودی عرب کو نقصان پہچانا چاہتے ہیں، ٹرمپ کا بیان غیر سنجیدہ ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ ملک پر ایک طاقتور بادشاہ حکومت کرتا ہے اور اس کی ریاست میں اہم شخصیت کے قتل کی ذمہ داری اس پر عائد نہ ہوتی ہو، ٹرمپ کا بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ ٹرمپ اس بھیانک قتل کے بعد بھی سعودی حکومت کے ساتھ تعلقات پر غور کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔

نااہل بادشاہ کی حکمرانی

مستقبل میں سعودیوں کو ایک سیاسی و جمہوری سعودی ریاست کی ضرورت پڑے گی لیکن موجودہ حالات میں محمد بن سلمان کی نگرانی میں تمام مذہبی، معاشی اور طبقۂ اشرافیہ خاموش ہی رہے گا، سعودی عرب میں حکمران طبقہ خوف کا شکار ہے اور خاشقجی کا قتل سعودی شہریوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے کہ سعودی ریاست کو فرد واحد کی حکمرانی سے کیسے دور کیا جائے اور اس کے لیے ان کی نظریں عالمی برادری پر ہیں کہ وہ کس طرح سعودی ریاست کو ایک شخص کی حکمرانی سے نکال کو سیاسی طور پر مضبوط کر سکتے ہیں۔

امریکا عوام کی آزادی اور قانون کی حکمرانی پر بات کر کے خاشقجی کے قتل پر سوالات اٹھانے کے باوجود محمد بن سلمان کی حمایت کر سکتا ہے، ایسی صورت میں محمد بن سلمان کو حد میں رکھنا ممکن ہوگا، جو کہ اس وقت بین الاقوامی قوانین کا حترام نہیں کر رہے ہیں اور نہ سفارتی اصولوں کا خیال رکھ رہے ہیں، خصوصاً ترکی کے ساتھ ان کے تعلقات بہت خراب ہیں۔

اگر جمال خاشقجی کے قتل کے بعد بھی امریکا سعودی عرب کی گرفت کے بجائے اس سے تجارتی معاملات بہتر بنائے رکھتا ہے تو یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ خاشقجی کے قتل جیسے واقعات ابھی اور ہوں گے۔ خاشقجی کے بدترین قتل پر امریکا کی طرف سے سعودی عرب کو ایک واضح پیغام جانا چاہیے کہ کسی بھی قسم کے قتل کو کسی بھی صورت برداشت نہیں کیا جائے گا۔ (ترجمہ: سمیہ اختر)

"Why the U.S. can't control MBS".
("Foreign Policy". November 5, 2018)

'نیا ۱۰۰ دن، پرانا ۹ دن'

فیاض راجہ

تبدیلی کے پہلے ۱۰۰ دنوں میں پاکستان کتنا تبدیل ہوا ہے؟ امید اور ناامیدی کے پنڈولم پر جھولتے عوام کی قسمت میں صرف دلفریب وعدے ہی ہیں یا پھر ملک کی سمت درست کرنے کے لیے پہلی اینٹ رکھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش بھی کی گئی؟

ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کی سعی کرنا اور پھر اس سعی لاحاصل کو عوام کے سامنے پیش کرنا، پیشہ ورانہ مجبوری کا تقاضا ٹھہرا مگر ہائے افسوس! واچ ڈاگ کے دعوے پر پورا اترنے کی کوششوں اور تنقید برائے تنقید کے 'بلٹ ان' فارمولے پر عمل کرنے کی 'جز لائینگ' مجبوریوں نے صحافی کو میڈیا مین بنا کر، اس سے تجزیے کی صلاحیت چھین کر ہاتھوں میں قلم کے بجائے فیصلے کا ہتھوڑا تھما دیا ہے۔

معاشی حالت انفرادی ہو یا ملکی، ہماری روزمرہ کی بیٹھکوں سے لے کر ٹی وی ٹاک شوز اور اخبارت کے مضامین تک میں اس کا ذکر لازم قرار پاتا ہے۔ مگر اس حقیقت کو شاید بہت کم لوگ سمجھتے ہیں کہ لمحہ موجود میں ہماری یا ملک کی جو معاشی حالت ہوگی اس کا تعلق صرف گزرے ۱۰۰ دنوں سے ہی جوڑنا شاید مکمل سچ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

کسی بھی دیرپا شخصی کاروبار کے دوران اٹھائے گئے اقدامات کے معاشی نتائج اگر ۱۰۰ دن میں حاصل کرنے کی خواہش رکھنا بے وقوفی ہے تو کاروبارِ حکومت کے دوران اٹھائے اقدامات کے معاشی نتائج ۱۰۰ دنوں میں بھلا کیسے حاصل کیے جاسکتے ہیں؟ معاشی ماہرین تو ایک طرف معیشت سے مکمل آگہی نہ رکھنے والے بھی یہ بات جانتے ہیں کہ معاشی اعشاریوں کا تقابل مہینوں کے بجائے برسوں سے کیا جانا ہی اقدامات کے حقیقی نتائج کو آشکار کرتا ہے۔

دنیا بھر میں کسی بھی ملک کی جی ڈی پی، افراطِ زر، زرِمبادلہ کے ذخائر، روپے کی قدر، ترسیلاتِ زر، برآمدات اور درآمدات جیسے اقتصادی اعشاریوں کا ذکر ماہانہ بنیادوں پر تو ضرور کیا جاتا ہے مگر ان کے درمیان تقابل صرف برسوں کے حساب سے ہی کیا جاتا ہے اور حکومتوں کی معاشی کارکردگی کے نتائج بھی روزانہ یا ماہانہ بنیادوں پر نہیں بلکہ گزرے اور موجودہ مالی سال کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں۔

آسانی کے لیے یوں سمجھ لیجیے کہ گزشتہ مالی سال جی ڈی پی اور افراطِ زر کی شرح کچھ یوں تھی اور رواں برس کچھ یوں رہی۔ یا پھر گزشتہ مالی سال میں زرِمبادلہ کے ذخائر، ترسیلاتِ زر، برآمدات اور درآمدات اتنی تھیں اور رواں مالی برس میں اتنی بڑھ گئیں یا کم ہوگئیں۔

پاکستان تحریکِ انصاف کی حکومت کے ۱۰۰ دن پورے ہونے پر صرف اور صرف وقتی معاشی اعشاریوں کو لے کر ان کی بنیاد پر ایسے ایسے فیصلے پڑھنے اور سننے کو مل رہے ہیں کہ 'حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں'۔ اور یوں ٹی وی اسکرینوں سے لے کر اخبارات کے صفحوں تک، روزانہ اور ماہانہ بنیادوں پر زور زبردستی نکالی اور پھیلائی بظاہر معاشی ناکامیوں کے شور میں سماجی کامیابیوں کی جھلک ڈھونڈنا گویا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی ڈھونڈنے کے مترادف بنا دیا گیا ہے۔

اگرچہ یہ درست ہے کہ معیشت کی سمت درست کرنے کے لیے اٹھائے گئے اقدامات کے نتائج دنوں یا مہینوں نہیں برسوں میں برآمد ہوا کرتے ہیں اور اس کے لیے موجودہ حکومت کو کم از کم ایک برس نہ دینا صریحاً زیادتی ہوگی۔ مگر کیا کریں بڑے بڑے بول بولنے والے اپوزیشن لیڈر عمران خان، وزیرِاعظم بننے کے بعد اپنے ہی بلند و بانگ دعوؤں کے بنائے پہاڑ کے اندر چھپ گئے ہیں۔ دوسری جانب یہ بھی غلط نہیں کہ ٹی وی چینلز اور اخبارات کے کئی نامور میڈیا پرسنز، عمران خان کی حکومت کے ۱۰۰ دن پورے ہونے پر بظاہر ردِعمل کی کیفیت کا شکار نظر آتے ہیں۔

تحریکِ انصاف کی حکومت کے پہلے ۱۰۰ دنوں میں صرف ملکی معیشت کے جلد باز فیصلوں نما تجزیوں کو ہی مکمل تصویر کی صورت پیش کرنے کے ساتھ ہمیں، وزیرِاعظم، کابینہ اور پارلیمنٹ کی کارکردگی سے لے کر گڈ گورنس، داخلہ محاذ، خارجہ پالیسی اور سماجی شعبے کے میدانوں میں تحریکِ انصاف کی حکومت کے ۱۰۰ روز کے اندر اٹھائے گئے اقدامات پر بھی ضرور نظر ڈالنا ہوگی۔

وزیرِاعظم ہاؤس میں نہیں رہوں گا!

اپنی پہلی تقریر میں عمران خان نے وزیرِاعظم ہاؤس میں نہ رہنے اور تمام گورنر ہاؤسز کو عوام کے لیے کھولنے کا وعدہ کیا۔ وزیرِاعظم نے ۱۱۰۰ کینال اور ۱۰۰ سے زائد کمروں پر مشتمل وزیرِاعظم ہاؤس کے بجائے ۴ کنال اور ۳ بیڈ روم پر مشتمل، اپنے ملٹری سیکریٹری کے گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا۔

۴۲۵ ملازمین میں سے صرف چند کے علاوہ تمام ملازمین کو وزیرِاعظم ہاؤس سے رخصت کر کے مختلف سرکاری محکموں کے حوالے کر دیا گیا۔ وزیرِاعظم ہاؤس کے اخراجات کم کرنے کے لیے فالتو گاڑیوں اور شوق سے پالی بھینسوں کی نیلامی کے فیصلے بظاہر نمائشی مگر اصولی ہی گردانے جائیں گے۔

فضول خرچی بند

حکومت کی جانب سے تمام وزیروں اور مشیروں کو فرسٹ کلاس میں سفر کرنے اور ان کے بیرون ملک علاج کرانے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ نئے پاکستان میں صدرِ مملکت ڈاکٹر عارف علوی غیر ملکی دورے پر جاتے ہوئے اپنے ملکی ائیر پورٹ پر بغیر پروٹوکول امیگریشن کرواتے ہوئے اپنے بیگ کی اسکریننگ خود کرواتے اور عام پرواز پر سفر کرتے ہوئے دکھائی دیے۔

وزیرِ خارجہ اقوامِ متحدہ میں خطاب کرنے گئے تو وزیروں، بیوروکریٹس اور صحافیوں کی فوج ظفر موج ان کے ساتھ نہیں گئی۔ وزیرِ خارجہ، امریکا میں مقامی ٹرین میں سفر کرتے نظر آئے۔ حکومت نے میرٹ پر کیریئر ڈپلومیٹ مقرر کرنے کا سلسلہ شروع کیا جو پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا ہے۔

معیشت اور سماجی شعبوں کے لیے اقدامات

حکومت نے کسانوں، اسکول، مساجد اور ہسپتالوں کے لیے بجلی کے نرخ ۵۰ فیصد کم کر دیے۔ یہ فیصلہ زرعی ملک کی معیشت اور سماجی شعبے کی خدمات کو سہارا دینے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

ٹیکسٹائل انڈسٹری کو گیس سستے داموں پر فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا یوں برسوں سے بند پڑی ٹیکسٹائل ملوں کے دوبارہ چلنے کی امید پیدا ہوگئی ہے اور پاکستان کی برآمدات میں اضافہ ممکن ہو سکے گا۔

ایک قدم آپ چلیں دو قدم ہم

کہاوت ہے کہ دوست بدلے جاسکتے مگر ہمسائے نہیں۔ خارجہ پالیسی کے محاذ پر اسی اصول کو مدِنظر رکھتے ہوئے پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پہلی مرتبہ امریکا کو برابری کی سطح پر جواب دیا گیا اور کرتارپور بارڈر کھولنے کے مشکل مگر بہادرانہ فیصلے سے بھارت کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا گیا۔ ان دونوں اقدامات کو پاکستان کے اندر اور باہر پسندیدگی اور حیرت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔

قبضہ مافیا کی شامت آئی

ملک بھر میں لینڈ مافیا کے بارے میں یہ خیال مستحکم ہو چکا تھا کہ ان پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا، جس کی وجہ یہ بتائی جاتی

رہی کہ ان کے ہاتھ بہت لمبے اور مضبوط ہیں۔ ان لمبے اور مضبوط ہاتھوں کے پیچھے سیاسی عناصر بھی ملوث رہے۔ لیکن تحریکِ انصاف کی حکومت کے ابتدائی ۱۰۰ دنوں میں لاتعداد ایسے مناظر دیکھنے کو مل رہے ہیں کہ جہاں نہ صرف اربوں روپے کی تجاوزات کو مسمار کیا گیا بلکہ لینڈ مافیا سے زمینوں پر قبضے بھی چھڑوائے گئے۔ یہ کارروائیاں بلا امتیاز ہورہی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ کہیں گندم کے ساتھ گھن بھی پس گیا ہو لیکن مجموعی طور پر اس عمل کو سراہنا چاہیے۔

تواتر کے ساتھ کابینہ اجلاس

ابھی زیادہ دور کی بات نہیں کہ جب پاکستان میں وزیرِاعظم کی کابینہ کے اجلاس کے لیے لوگ مہینوں ترسا کرتے تھے۔ کیا یہ تبدیلی نہیں کہ معاشی، سیاسی، داخلی اور خارجی امور پر غور اور بات چیت کے لیے ایک تواتر کے ساتھ کابینہ کے ۱۴ اجلاس کیے گئے۔ ریکارڈ کی درستی کے لیے بتانا ضروری ہے کہ گزشتہ تجربہ کار حکومت کے پہلے ۱۰۰ دنوں میں وفاقی کابینہ بھی تشکیل نہ پاسکی تھی۔

وزیروں اور بیوروکریٹس پر سختیاں

وزیرِاعظم عمران خان نے کابینہ میں اپنے وزیروں پر چیک رکھنے کا ایک اصول بھی وضع کیا ہے۔ حکم دیا گیا ہے کہ وہ سال میں صرف ۳ بار غیر ملکی دورے کرسکیں گے اور اکانومی کلاس میں سفر کریں گے۔

سینیٹ اور اسمبلی اجلاسوں کے دوران کوئی وزیر غیر ملکی دورہ نہیں کرے گا اور پارلیمانی اجلاس کے دوران اسلام آباد میں اپنی موجودگی کو یقینی بنائیں گے۔ وفاقی وزرا اور بیوروکریٹس پر پابندی عائد کی جاچکی ہے کہ وہ اپنا علاج بیرونِ ملک کے بجائے صرف اپنے ملک میں ہی کرا سکیں گے۔

پاکستان سٹیزن پورٹل کا قیام

عوامی شکایات کے ازالے کے لیے پاکستان سٹیزن پورٹل قائم کیا گیا ہے جہاں ایک منٹ میں ۳ لاکھ ۸۲ ہزار شکایات درج کروائی گئیں۔ ان شکایات پر کارروائی کا عمل بھی جاری ہے۔ یقیناً یہ کوشش دکھوں کے مارے عوام کے لیے ریلیف ملنے کی امید کی پہلی کرن ثابت ہوسکتی ہے۔

سماجی انصاف اور قانون کے شعبے میں وومن ایکشن پلان پر ایک بھرپور کام ہوا ہے۔ وراثت کے حوالے سے طریقہ کار کو تبدیل کرکے اب نادرا سے تصدیق کروائی جائے گی۔ عام طور پر اس معاملے کو حل ہونے میں ۷ سے ۸ برس لگتے ہیں، لیکن اب اس عمل کو ۱۵ سے ۳۰ دنوں میں مکمل کرنے پر کام ہورہا ہے۔

لیگل جسٹس اتھارٹی

قانونی معاونت سے متعلق بل ۱۰ برسوں سے زیرِ التوا تھا، جس پر کام کیا گیا ہے۔ لیگل جسٹس اتھارٹی قائم کی جارہی ہے جو پسماندہ علاقوں میں لوگوں کو قانونی معاونت دے گی۔ ایک اچھے پینل سے وکیل دیا جائے گا اور اگر کسی کے پاس جرمانے یا ضمانت کی رقم نہیں ہے تو اس کو کس طرح ریلیف دیا جائے یہ بھی اتھارٹی کی ذمہ داری ہوگی۔

آسیہ بی بی کیس

ملک کے داخلی محاذ پر، آسیہ بی بی کی رہائی کے بعد مذہبی جماعتوں کا ملک گیر احتجاج تحمل اور سمجھداری کے ساتھ کیے گئے فیصلوں کی بدولت صرف ۴ دنوں میں ختم ہوگیا۔ ایک سال قبل گزشتہ حکومت میں دیا گیا دھرنا حکومت سے سنبھالا نہیں گیا تھا۔ وہ دھرنا ۲۰ دن تک جاری رہا۔ جو وفاقی وزیر کی رخصتی، ناکام پولیس آپریشن اور فوج کی ضمانت کے بعد ختم ہوا تھا۔

ایوان میں وزیرِاعظم کی کم حاضری

موجودہ حکومت کے پہلے ۱۰۰ دنوں میں قومی اسمبلی کے ۵ اجلاس ہوئے اور یہ اجلاس ۲۴ دن جاری رہے۔ اسمبلی قواعد کی روشنی میں سال کے ۶۵ ۳ دنوں میں قومی اسمبلی کے لیے ۱۳۰ دن کارروائی چلانا ضروری ہے۔ اس شرح کو دیکھتے ہوئے یہ بھی ایک قابلِ ذکر کارکردگی ہے۔ وزیرِاعظم عمران خان ۲۴ میں سے صرف ۷ دن ایوان میں آئے۔ اسمبلی میں ان کی ۲۹ فیصد حاضری یقیناً کم ہے اور اس کمی کا کوئی جواز نہیں تاہم یہ حاضری ماضی میں ان کی ایوان میں ۵ فیصد حاضری کے مقابلے میں بہتر ہے۔ واضح رہے کہ سابقہ حکومت کے ۵ سالہ دور میں نواز شریف کی حاضری ۱۰ فیصد جبکہ شاہد خاقان عباسی کی حاضری ۱۹ فیصد رہی تھی۔

قائدِ ایوان کے انتخاب کے ۳۰ دن بعد تک قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹیوں کا قیام اسمبلی کے قواعد کی روح سے ضروری ہے مگر کیا کریں کہ اس پر، اس مرتبہ تو کیا گزشتہ ۳ جمہوری حکومتوں میں بھی کم ہی عمل ہوا ہے۔ پچھلی حکومت کے پہلے ۱۰۰ دنوں میں بھی بدقسمتی سے کوئی قائمہ کمیٹی قائم نہ ہوسکی تھی۔

قومی اسمبلی میں اگر بڑی مشکل سے سادہ اکثریت پوری کرنے والی تحریک انصاف پہلے ۱۰۰ دنوں میں کسی قانون سازی کا پہاڑ نہ چڑھ سکی تو ۲ تہائی اکثریت رکھنے والی نواز لیگ اور فرینڈلی اپوزیشن کا ساتھ رکھنے والی پیپلز پارٹی بھی کوئی قانون سازی نہیں کرسکی تھی۔

پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا چیئرمین کون؟

احتساب کی بات کی جائے تو تحریکِ انصاف کی حکومت کے پہلے ۱۰۰ دنوں میں پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا عہدہ خالی ہے، کیونکہ یہ عہدہ کس کو دیا جائے، ابھی تک اس پر اتفاق نہیں ہوسکا ہے۔ مگر کیا کریں کہ گزشتہ دورِ حکومت کے پہلے ۱۰۰ دنوں میں بھی نہ صرف یہی حال تھا بلکہ پہلے ۱۰۰ دن نیب کے چیئرمین کی تعیناتی بھی نہیں ہوسکی تھی۔

گستاخانہ خاکے برداشت نہیں!

۱۸ اگست ۲۰۱۸ء کو عمران خان نے پاکستان کے ۲۲ ویں وزیراعظم کے طور پر حلف اٹھایا۔ وزیراعظم بنتے ہی خارجہ پالیسی کے محاذ پر پہلا بڑا چیلنج ڈچ پارلیمنٹ میں گستاخانہ خاکوں کے حوالے سے منعقد ہونے والا مقابلہ تھا۔ حکومت نے اس مقابلے کے خلاف چاروں صوبائی اسمبلیوں، قومی اسمبلی اور سینیٹ سے قرارداد منظور کروائی۔ وزیراعظم عمران خان نے اس معاملے کو اقوام متحدہ اور او آئی سی میں لے جانے کا اعلان کیا۔

حکومت کی محنت رنگ لائی اور ڈچ حکومت نے ۳۰ اگست کو یہ مقابلہ منسوخ کردیا۔ پوری دنیا کے تمام بڑے اخبارات میں یہ سرخی لگی کہ پاکستانی حکومت کے احتجاج کی وجہ سے ڈچ پارلیمنٹ میں گستاخانہ خاکوں سے متعلق ہونے والا تصویری مقابلہ منسوخ کردیا گیا ہے۔

مولے نوں مولا نہ مارے تے مولا نہیں مر سکدا!

ان تمام تر حقائق کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ گزشتہ حکومتوں میں جو نہ ہوسکا تھا وہ اس بار بھی نہیں ہونا چاہیے تھا، بلکہ اس بار تو وہ سارے کام لازمی ہونے چاہیے تھے کیونکہ اس بار ماضی کے مقابلے میں وعدے اور دعوے کچھ زیادہ ہی تھے، اور حقیقت تو یہ بھی ہے کہ عمران خان اور تحریکِ انصاف کی قیادت کے بلند و بانگ دعوؤں کے باعث ان کا مقابلہ کسی اور سے نہیں بلکہ اپنے آپ ہی سے ہے۔

مغربی جمہوریت میں کسی بھی حکومت کے پہلے ۱۰۰ دنوں کو اس کا ہنی مون پیریڈ گردانا جاتا ہے مگر عمران خان کو یہ سہولت حاصل نہیں ہوسکتی کیونکہ ۱۰۰ دن کے ایجنڈے اور اس پر عمل درآمد کا دعویٰ خود عمران خان ہی کا تھا۔

گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تحریکِ انصاف کی حکومت کے پہلے ۱۰۰ دنوں میں کچھ اور بدلا ہو یا نہیں، لیکن ہاں 'نیا ۹ دن پرانا ۱۰۰ دن' کا محاورہ 'نیا ۱۰۰ دن پرانا ۹ دن' میں بدل گیا ہے کیونکہ میں، آپ اور ہم سب پرانے پاکستان کو ۹ دن میں بھلا کر نیا پاکستان ۱۰۰ دن میں بنانا چاہتے ہیں اور اس کی وجہ بھی خود عمران خان ہی ہیں کیونکہ 'مولے نوں مولا نہ مارے تے مولا نہیں مر سکدا'۔

(بحوالہ: ''ڈان ٹی وی''۔ ۲۹ نومبر ۲۰۱۸ء)

امریکا کو غصہ کیوں آتا ہے؟

جنگی جنون سے نفع کمانے والے

پندرہویں قسط

محمد ابراہیم خان

کسی بھی ملک میں جنگ کے حامی سیاست دانوں، جرنیلوں اور کارپوریٹ ایگزیکٹیوز سے پوچھیے کہ وہ جنگ کی حمایت کیوں کرتے ہیں تو جواب ملے گا کہ وہ جمہوریت، آزادی، انصاف اور امن کے لیے جنگ کی بات کرتے ہیں۔ مگر یہ سب محض دعوے ہیں۔ کہنے، سمجھنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ جو با اثر شخصیات جنگ کی حمایت کرتی ہیں انہیں دراصل جنگ سے بہت سے فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ جنگ کی کوکھ سے تباہی جنم لیتی ہے اور تباہی کے لیے ہتھیار درکار رہتے ہیں۔ ہر وقت جنگ کی باتیں کرنے والوں کو جنگ سے تعمیر نو کے معاہدے ملتے ہیں، نئی منڈیاں دستیاب ہوتی ہیں، قدرتی وسائل تک رسائی ملتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مزید طاقت کا حصول ممکن ہو جاتا ہے۔

امریکا میں یہ تصور عام ہے کہ محکمہ دفاع عوام کی جیب خالی کرانا چاہتا ہے اور یہ کہ اگر اس کا بس چلے تو سانس لینے پر بھی ٹیکس عائد کردے۔ اس وقت ایک لاکھ سے زائد کمپنیاں ہیں جو امریکی محکمہ دفاع سے کسی نہ کسی طور وابستہ ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ چند ایک بڑے کارپوریٹ ادارے ہی ہیں جو جنگی جنون سے بھرپور ''استفادہ'' کر رہے ہیں۔ یونائیٹڈ ٹیکنالوجی، ہنیکسٹرون، بوئنگ، لاک ہیڈ مارٹن، جنرل ڈائنامکس، رتھیون، نارتھروپ گرومن اور اسی قبیل کے دو تین ادارے اور ہیں جو امریکا کے جنگی جنون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قابل ذکر منافع کما رہے ہیں۔ جب بھی کسی محاذ پر بم گرتے ہیں یا میزائل برسائے جاتے ہیں تو ان کمپنیوں کے ایگزیکٹیوز کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں اور انہیں فضا میں ہر طرف صرف کیش دکھائی دینے لگتا ہے!

کسی بھی خطے میں جنگ چھڑنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلحہ ساز اداروں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ امریکی محکمہ دفاع اندرونی کھپت کے لیے بہت کچھ خریدتا ہے اور بیرونی عسکری مہم جوئی کے لیے بھی۔ اور پھر ان اسلحہ ساز اداروں کو بیرونی آرڈر بھی ملتے ہیں۔ خلیج کی پہلی جنگ میں امریکا نے جدید ترین ہتھیار استعمال کیے اور دنیا کو اپنی طاقت دکھائی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ ختم ہوتے ہی خطے کے ممالک سے ان اسلحہ ساز اداروں کو انتہائی پُرکشش آرڈر ملے۔ بعض اسلحہ ساز اداروں نے بہت بڑا آرڈر ملنے پر چند ایک چیزیں مفت بھی دیں۔ مثلاً ۱۰۰ ایف سولہ طیاروں کے ساتھ ایک ہزار نیپام بم مفت دیے گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ امریکا کے جنگی جنون سے درحقیقت فائدہ کون اٹھاتا ہے۔ ان میں سب سے نمایاں ڈک چینی ہیں جو بُش سینئر کے دور میں وزیر دفاع اور بُش جونیئر کے دور میں نائب صدر کے منصب پر فائز رہے۔ جنگ کی جس قدر حمایت ڈک چینی نے کی ہے اتنی کسی اور امریکی سیاست دان نے نہیں کی۔ بُش سینئر کے دور میں ڈک چینی نے پاناما اور خلیج کی پہلی جنگ کی نگرانی کی اور بُش جونیئر کے دور میں افغانستان اور عراق دونوں پر مسلط کی جانے والی جنگ پر نظر رکھی۔

ڈک چینی کی مہارت کا عالم یہ ہے کہ دو جنگوں کے درمیانی عرصے میں وہ ''تعمیری'' کام کرتے ہیں یعنی جنگ سے تباہ ہو جانے والے معاشروں میں تعمیر نو کا سلسلہ شروع کراتے ہیں! اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکا کا جنگی جنون کم ہونے کا نام کیوں نہیں لیتا۔

۱۹۹۳ء میں ڈک چینی کو دنیا کی سب سے بڑی آئل سروسز کمپنی ہیلی برٹن کا چیف ایگزیکٹیو افسر بنایا گیا۔ یہ کمپنی بہت بڑی ملٹری کنٹریکٹر بھی ہے۔ خلیج کی پہلی جنگ کے بعد کویت کی آئل انڈسٹری کی تعمیر نو کا ٹھیکا ہیلی برٹن ہی کو ملا تھا۔ خلیج کی دوسری جنگ کے بعد جنگ کے نتیجے میں پھیلنے والی تباہی کے آثار ختم کرنے کا ٹھیکا بھی ہیلی برٹن کو ملا۔ یہ بھی اچھا طریقہ ہے کہ پہلے کسی خطے پر جنگ مسلط کرو، پھر صفائی کرو، پھر جنگ مسلط کرو، پھر صفائی کرو۔ یعنی بگاڑ بھی خود پیدا کرو اور اس بگاڑ کو ختم کرنے کا ٹھیکا بھی حاصل کرو۔ جنگی جنون میں مبتلا شخصیات اور ادارے اسی نوعیت کے کھیل کھیلتے ہیں۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر امریکا نے افغانستان کو تباہ کرنے کے بعد جب عراق پر جنگ مسلط کی تو وہاں ایک لاکھ ۳۵ ہزار امریکی فوجیوں کی رہائش، کھانا پینا اور دیگر سہولتوں کی فراہمی ہیلی برٹن نے اپنے ذمے لے لی۔ اس ''نیک کام'' پر اس نے کروڑوں ڈالر خرچ کیے۔ کیوں؟ اتنی فراخ دلی آخر کس لیے؟ سیدھی سی بات ہے۔ ہیلی برٹن کو عراق میں تعمیر نو اور بالخصوص آئل انڈسٹری کی بحالی کے لیے جو ٹھیکا ملا وہ ۱۰۰ ارب ڈالر سے زائد کا تھا۔ جب اتنا بڑا منافع مل رہا ہو تو چند سو کروڑ ڈالر فوجیوں کی بہبود کے نام پر خرچ کرنے میں حرج کیا ہے؟ اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ واشنگٹن میں چند بڑے اور غیر معمولی اثرات والے دوستوں کا ہونا کس قدر سودمند ثابت ہوتا ہے۔ ڈک چینی نے واشنگٹن میں اپنے تعلقات کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنی کمپنی کو اس قدر ٹھیکے دلائے ہیں کہ اب وہ بھول گئی ہے کہ خسارہ کیا ہوتا ہے۔

ڈک چینی نے ہیلی برٹن کو غیر معمولی ٹھیکے دلائے ہیں اور اس کا بھرپور صلہ بھی پایا ہے۔ انہیں مختلف مدوں میں ادائیگی کی جاتی ہے۔ انتہائی پرکشش پیکیج کے تحت کام کرنے والے ڈک چینی کے ذاتی اثاثے کروڑوں ڈالر کے ہیں۔ ڈک چینی نے ویت نام میں فوجی کی حیثیت سے خدمات انجام دینے سے بچنے کے لیے پانچ مرتبہ ڈرافٹ ڈیفرمنٹس حاصل کیں مگر دوسروں کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنے کے لیے وہ ہمیشہ فعال رہے ہیں۔ ان کی اہلیہ لِن بھی اس حوالے سے فعال رہی ہیں۔ انہیں لاک ہیڈ مارٹن کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل کیا گیا۔ ۲۰۰۱ء میں ڈک چینی وائٹ ہاؤس میں واپس آئے تو انہوں نے لاک ہیڈ مارٹن کو لڑاکا طیارے بنانے کا سیکڑوں ارب ڈالر کا ٹھیکا دلوایا۔ اس کا فائدہ، ظاہر ہے، لِن کو بھی پہنچا۔

امریکی جنگی جنون سے غیر معمولی فوائد بٹورنے والوں میں رچرڈ پرل بھی شامل ہیں۔ رچرڈ امریکی محکمہ دفاع میں ڈیفنس پالیسی بورڈ میں رہے ہیں۔ عراق پر مسلط کی جانے والی دونوں جنگوں کا مکمل خاکہ رچرڈ پرل ہی نے تیار کیا تھا۔ انہیں ان دونوں جنگوں کا ''معمار'' بھی کہا جاتا ہے۔ سابق امریکی وزیر دفاع ڈونلڈ رمسفیلڈ نے جنگی جنون کو ہوا دینے کے لیے ملٹری ٹیکنالوجی میں انقلابی تبدیلی لانے کا تصور پیش کیا تو رچرڈ پرل نے اس معاملے کو آگے بڑھایا اور ملٹری ٹیکنالوجی کے شعبے میں انقلاب برپا کرنے کے لیے بھرپور محنت کی۔

رچرڈ پرل نے واشنگٹن میں اپنے انتہائی با اثر دوستوں کے ساتھ ٹرائی ایم پارٹنرز کے نام سے کمپنی قائم کی۔ اس کمپنی کو انہوں نے امریکی محکمہ دفاع سے بڑے ٹھیکے دلوائے۔ یہ سب کچھ تعلقات ہی کی بنیاد پر تھا۔ رچرڈ پرل نے اقتدار کے ایوانوں میں جو وقت گزارا تھا اس سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنی کمپنی کو مضبوط کیا۔

رچرڈ پرل اسرائیلی حکومت کے مشیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے ہیں۔ جو خیالات ان کے ذہن میں پنپتے رہتے ہیں، وہ انہوں نے امریکا اور اسرائیل دونوں ہی کے لیے یکساں طور پر بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ امریکا ہو یا اسرائیل، رچرڈ پرل کا مشورہ یہی ہوتا ہے کہ کسی بھی مسئلے کو

عمدگی سے حل کرنا ہے تو جنگ چھیڑو۔ ان کے نزدیک تمام مسائل کا صرف ایک حل ہے اور وہ ہے جنگ۔ وہ جنگ شروع کرنے اور پھر اسے طول دیتے رہنے کے حامی ہیں تاکہ طاقت زیادہ سے زیادہ بروئے کار لائی جائے، اسلحہ زیادہ سے زیادہ استعمال ہو۔ اسلحہ جتنا زیادہ استعمال کیا جائے گا مزید اسلحے کی کھپت اسی قدر بڑھے گی اور یوں اسلحہ ساز اداروں کے لیے مزید پنپنے کی بھرپور گنجائش پیدا ہوتی رہے گی۔

ڈک چینی، رچرڈ پرل اور دیگر بااثر شخصیات نے ایک وسیع گروپ تشکیل دے کر جنگی جنون کو ہوا دیتے رہنے کی بھرپور کوشش کی ہے تاکہ اسلحہ ساز اداروں کا چولہا جلتا رہے۔ جنگی جنون کو ہوا دینے سے دنیا میں کتنی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور ہو رہی ہیں اس سے ان شخصیات کو کچھ غرض نہیں۔ یہ تو صرف اتنا چاہتی ہیں کہ ان کے گروپ سے وابستہ ملٹری کنٹریکٹر یعنی اسلحہ ساز اور جنگ سے متعلق خدمات فراہم کرنے والے اداروں کو فروغ ملتا رہے اور اس کے صلے میں ان کی اپنی جیبیں بھی بھری جاتی رہیں۔

رچرڈ پرل نے ہر اس ملک کے خلاف جنگ کی راہ ہموار کی ہے، جو اسرائیل کا دشمن ہو۔ ایران، عراق اور شام دونوں پر جنگ مسلط کرنے میں مرکزی کردار رچرڈ پرل نے ادا کیا۔ اور جب یہ معاملہ ختم ہوا تو رچرڈ پرل اور ان کے ہم خیال لوگوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر بھرپور منافع بٹورتے رہنے کا اہتمام کیا۔

ڈک چینی، رچرڈ پرل اور دیگر ہم خیال شخصیات نے سیاسی اثرات کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے غیر معمولی منافع کی راہ ہموار کی ہے۔ اقتدار کے ایوانوں میں دور تک رسائی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ یہ لوگ منظور نظر ملٹری کنٹریکٹر کو عام سی چیز کے حیرت انگیز دام دلاتے ہیں۔ ملٹری کنٹریکٹرز کے ذریعے فراہم کیے جانے پر کوئی عام سی چیز بھی سیکڑوں ڈالر کی پڑتی ہے اور یہ سب کچھ عوام کی جیب سے ادا کیا جاتا ہے۔ بہت سے کنٹریکٹ انتہائی پراسرار اور مشکوک ہوتے ہیں مگر کس میں ہمت ہے کہ جواب طلب کرے۔ اگر کوئی اعتراض کر بیٹھے تو اسے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی تو عوام کے مفاد میں بولنے کی پاداش میں اسی کے خلاف کارروائی شروع کرنے کی دھمکی بھی دی جاتی ہے۔ جنگی جنون سے فوائد بٹورنے والوں کے پاس معترضین کو جواب دینے کے لیے پہلے سے ''ٹھوس دلائل'' ہوتے ہیں۔ کسی بھی غلط بات کو درست ثابت کرنے کے لیے انہوں نے بھرپور تیاری پہلے سے کر رکھی ہوتی ہے۔ ایسا کرنے ہی میں ان کی کامیابی ہے۔

امریکا نے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ محفوظ رکھنے کے لیے بہت سے ایسے اقدامات کیے ہیں، جن کے نتیجے میں دنیا بھر میں خدشات کی فصل تیار ہوئی ہے۔ میزائل ڈیفنس پروگرام کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ امریکا چاہتا ہے کہ اس کی طرف داغا جانے والا ہر میزائل روک دیا جائے، ناکارہ بنا دیا جائے۔ میزائل ڈیفنس پروگرام کے حوالے سے دنیا بھر میں خدشات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ امریکا خود کو محفوظ بنانے کے چکر میں زیادہ سے زیادہ متنازع ہوتا جارہا ہے۔ دنیا بھر میں یہ تصور عام ہے کہ اگر امریکا نے میزائل شیلڈ قائم کر لی یعنی اپنے طرف آنے والے ہر میزائل کو روکنے کا نظام وضع کر لیا تو باقی دنیا کے لیے خطرات بڑھ جائیں گے کیونکہ پھر وہ کسی بھی ملک کو زیادہ بے فکری سے نشانہ بنایا کرے گا۔ یہی سبب ہے کہ کئی ممالک امریکا کو نشانہ بنانے کی بھرپور صلاحیت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چین نے بھی اتنے میزائل تیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے جن کا سامنا کرتے ہوئے میزائل شیلڈ بھی تھک ہار جائے۔ ایک واقعہ دوسرے کو اور دوسرا تیسرے کو جنم دے گا۔ اگر چین زیادہ میزائل بنائے گا تو بھارت بھی زیادہ میزائل بنانا چاہے گا۔ اور جب بھارت زیادہ میزائل بنائے گا تو پاکستان پیچھے رہنا کیوں پسند کرے گا؟ یعنی امریکا کا جنگی جنون پوری دنیا میں جنگی جنون ہی کو ہوا دے گا اور اس کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ خرابی کی راہ ہموار ہوتی چلی جائے گی۔

امریکا نے جب یہ دیکھا کہ اس کی عسکری قوت غیر معمولی ہے تو اس نے تخفیف اسلحہ کی تمام کوششوں سے خود کو الگ کرنا شروع کیا۔ ۱۹۷۲ء میں امریکا نے غیر روایتی یعنی کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں پر پابندی کے معاہدے پر دستخط کیے، مگر بعد میں یک طرفہ طور پر الگ ہوگیا۔ سبب یہ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اسلحہ بنانا اور بیچنا چاہتا تھا۔ اور پھر اپنی ضرورت کے تحت جنگیں بھی مسلط کرنی تھیں جس کے لیے اسلحہ درکار تھا۔

امریکا نے جوہری تجربات پر جامع پابندی کے معاہدے (سی ٹی بی ٹی) پر دستخط کرنے سے بھی انکار ہی کیا ہے کیونکہ اس معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد وہ مزید جوہری تجربوں کے حق سے محروم ہو جائے گا۔ واضح رہے کہ اس معاہدے پر ۱۶۴ ممالک دستخط کر چکے ہیں۔ اب امریکی محکمہ دفاع نے اس بات پر زور دینا شروع کر دیا ہے کہ بہت چھوٹے جوہری ہتھیار تیار کیے جائیں، جو محدود رقبے کے لیے ہوں یعنی جنگ میں کسی بھی محاذ پر استعمال کیے جاسکیں اور مطلوبہ نتائج کے حصول میں معاون ثابت ہوں۔

سرد جنگ کے دور میں امریکا کے سامنے سوویت یونین جیسا دشمن تھا، جس سے بچنے اور باقی دنیا کو بچانے کے نام پر امریکا اور یورپ بہت کچھ کر رہے تھے، مگر اب کیا ہے؟ سوویت یونین تو تحلیل ہو چکا ہے۔ اب امریکا کو کس سے خطرہ لاحق ہے۔ خود کو محفوظ رکھنے کے نام پر وہ پوری دنیا کو انتہائی غیر محفوظ بنانے پر تلا ہوا ہے۔ امریکا نے اتنا اسلحہ تیار کر رکھا ہے کہ اگر وہ خرچ ہو تو پوری دنیا تباہ ہو جائے۔

امریکا نے باقی دنیا کو تو جراثیمی ہتھیار بنانے سے روک رکھا ہے مگر خود اس حوالے سے تحقیق کرتا رہا ہے۔ اور جواز یہ پیش کیا گیا ہے کہ امریکا ان ہتھیاروں سے موثر دفاع کے لیے طریقے سیکھ رہا ہے۔

امریکا نے جو خطرناک ہتھیار تیار کر رکھے ہیں، کیا وہ محفوظ ہاتھوں میں ہیں؟ امریکا باقی دنیا کو غیر متوازن اور جنونی قرار دے کر حملے کرنے پر یقین رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر امریکی ہتھیار امریکا ہی کی حدود میں پلنے والے جنونیوں اور انتہا پسندوں کے ہاتھ لگ گئے تو کیا ہوگا؟ امریکا میں بھی تو کئی ایسے انتہا پسند گروپ ہیں، جو امریکا کی برتری ہر حال میں برقرار رکھنے کے لیے کچھ بھی کر گزرنے پر یقین رکھتے ہیں۔

سوویت یونین کی تحلیل کے بعد بھی امریکا نے اپنے جنگی جنون کو لگام دینے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا دفاعی بجٹ اب بھی اس کے بعد کے پچیس ممالک کے اجتماعی دفاعی بجٹ سے زائد ہے! محتاط اندازے کے مطابق اس وقت امریکی دفاعی بجٹ پوری دنیا کے دفاعی اخراجات کے ۳۶ فیصد کے مساوی ہے! امریکا ہر سال ہزاروں ارب ڈالر اپنی سلامتی یقینی بنانے اور اس مقصد کے لیے دوسروں کی سلامتی سے کھیلنے پر خرچ کر رہا ہے۔

امریکا نے خود کو بچانے کے لیے پوری دنیا کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ جنگی جنون کے ہاتھوں امریکا کے دشمنوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ اب اسے کسی پر اعتبار نہیں رہا۔ حد یہ ہے کہ یورپ میں بھی اس کی نیت پر شک کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ برطانیہ نے عسکری مہم جوئی آگے بڑھانے میں امریکا کا بھرپور ساتھ دیا ہے مگر اب برطانیہ میں بھی جنگی جنون کے مخالفین کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ امریکا نے جو کچھ کیا ہے، اس کے نتائج کا بھی اسے خوب اندازہ ہے۔ امریکا سے نفرت کرنے والوں کی محض تعداد نہیں بڑھ رہی بلکہ نفرت کے اظہار کے طریقے بھی وضع کیے جارہے ہیں۔ جن ممالک کو امریکا نے تاراج کیا

باقی صفحہ نمبر ۳

اوپیک کا مخمصہ

Frand Verrastro
Kevin Book
Larry Goldstein

تیل برآمد کرنے والے ممالک کی تنظیم ''اوپیک'' ایک بار پھر مشکل میں ہے۔ اوپیک کے سیاہ وسفید کے مالک چاہتے ہیں کہ عالمی منڈی میں خام تیل کے نرخ قابو میں رہیں۔ کسی کو اگر زیادہ فائدہ نہ پہنچے تو زیادہ نقصان بھی نہ ہو۔ مگر اس مقصد کا حصول غیر معمولی حد تک دشوار ثابت ہورہا ہے۔ عالمی سطح پر سیاسی وسفارتی حالات بہت تیزی سے تبدیل ہورہے ہیں۔ طلب و رسد کے درمیان قابلِ قبول سطح پر توازن پیدا نہیں ہو پا رہا۔ چند ماہ کے دوران بہت کچھ بہت تیزی سے تبدیل ہوا ہے۔ ایک طرف امریکا، روس اور سعودی عرب نے تیل کی پیداوار میں اضافے کا عندیہ دیا۔ دوسری طرف مقامی یا علاقائی سطح پر ایڈجسٹمنٹ ہوئی یعنی موسم بدلا اور تیل صاف کرنے کے کارخانوں کی مینٹی ننس کا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایران پر امریکا نے جو پابندیاں عائد کی ہیں ان کے تحت ایران تیل برآمد کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔ یہ صورتِ حال بھی تیل کی عالمی منڈی کو پریشان کن حد تک متاثر کررہی ہے۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک یکساں طور پر عالمی معیشت میں پیدا ہونے والی سست رفتاری سے پریشان ہیں۔ کم و بیش ۶ ماہ کے دوران آئل مارکیٹ عدم توازن کا شکار رہی ہے۔ طلب و رسد کے درمیان معقول توازن پیدا نہ ہونے کے باعث تیل برآمد کرنے والے ممالک غیر یقینی صورتِ حال کا سامنا کرنے پر مجبور ہیں۔ ایسے میں ان کے لیے یہ سمجھنا بھی دشوار ہوگیا ہے کہ کس وقت کس نوعیت کے اقدامات کیے جائیں۔ ماہرین کی رائے یہ رہی ہے کہ سال کی تیسری سہ ماہی کے دوران تیل کی منڈی غیر معمولی دباؤ کا شکار ہوگی ۲۰۱۹ء کے اوائل میں معاملہ سرپلس تک چلا جائے گا۔

چند ہفتوں کے دوران مختلف عوامل نے اپنا رنگ دکھانا شروع کردیا ہے۔ بعض معاملات بالکل کھلے ہیں اور بعض اتنے ڈھکے چھپے ہیں کہ انہیں سمجھنا آسان نہیں۔ رسد بڑھ گئی ہے۔ سعودی عرب اور روس نے پیداوار بڑھائی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ امریکا کو بھی پیداوار بڑھانے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ لیبیا اور نائجیریا کی تیل کی پیداوار مستحکم رہی ہے۔ ایران نے تیل کی پیداوار میں واضح کمی کردی ہے۔ عراق کی تیل کی پیداوار اگرچہ کم ہے تاہم سیاسی استحکام یقینی بنائے جانے اور لاجسٹکس کے مسائل حل کیے جانے کی صورت میں وہاں تیل کی پیداوار بڑھائی جاسکتی ہے۔ ٹرمپ انتظامیہ نے ایران کی تیل کی برآمدات پر پابندی تو عائد کردی ہے، تاہم چند حلیفوں کو کم و بیش ۶ ماہ تک ایران سے تیل درآمد کرتے رہنے کی اجازت دی ہے۔ اس اقدام نے عالمی منڈی میں بہت سوں کو سکون کا سانس لینے کا موقع فراہم کیا ہے۔ مستقبل قریب میں تیل کی پیداوار کے حوالے سے عالمی منڈی میں سٹے بازی کرنے والوں کو دوبارہ قدم جمانے اور سرمایا کاری کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کا موقع ملا ہے۔

عالمی حالات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں نے بہت سے عجیب اثرات مرتب کیے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ڈالر مضبوط ہوا ہے۔ عالمی مالیاتی منڈی میں درستی کے حوالے سے کیے جانے والے اقدامات سے امریکی کرنسی کو زیادہ مضبوط ہونے کا موقع ملا ہے۔ اس کے نتیجے میں عالمی منڈی میں تیل کے نرخ ۲۰ فیصد کی حد تک گرے ہیں۔ اوپیک کا بڑا اجلاس ۶ دسمبر کو ویانا میں ہونا ہے۔ اوپیک کے رکن ممالک کی وزارتی سطح کی کمیٹی نے حال ہی میں ایک اجلاس کے دوران معاملات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے تاکہ پیداوار کو متوازن رکھ کر قیمتیں اطمینان بخش حد تک مستحکم رکھی جاسکیں۔ متحدہ عرب امارات کے دارالحکومت ابوظہبی میں ہونے والے اس اجلاس کا بنیادی مقصد تیل کی عالمی منڈی میں رونما ہونے والی تمام بڑی تبدیلیوں کا جائزہ لینا تھا تاکہ معاملات کو اپنے مفادات کے لیے زیادہ سے زیادہ کارگر طریقے سے بروئے کار لانے کی حکمتِ عملی مرتب کی جاسکے۔

اوپیک کے وزارتی اجلاس میں اس نکتے پر غور کیا گیا کہ پیداوار میں کمی کے لیے کیا لائحۂ عمل اختیار کیا جانا چاہیے۔ اجلاس کے شرکاء اس نتیجے پر پہنچے کہ اس وقت عالمی سطح پر تیل کی رسد غیر معمولی ہے، یعنی کوئی بھی ملک رسد کی کمی محسوس نہیں کررہا۔ یہ صورتحال عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں کو نیچے لانے کا باعث بن رہی ہے۔ اوپیک کے رکن ممالک چاہتے ہیں کہ پیداوار میں اس حد تک کمی کردی جائے کہ عالمی منڈی میں تیل کی کمی محسوس کی جانے لگے اور رسد بڑھانے پر زور دینے کا ماحول پیدا ہو۔ اِسی صورت قیمتوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوسکتا ہے۔

اوپیک کے ارکان کے درمیان سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ تیل کی پیداوار گھٹانے کے حوالے سے کوٹا کس طور تقسیم کیا جائے۔ اس وقت معاملہ یہ ہے کہ اوپیک کے ارکان سمیت تیل برآمد کرنے والے تمام ممالک چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ تیل نکال کر فروخت کردیں۔ تیل کی پیداوار گھٹانے کا سیدھا مفہوم ہے، برآمد میں کمی۔ تیل کی برآمد میں کمی متعلقہ ممالک کی معیشت پر منفی اثرات مرتب کرے گی۔ تیل برآمد کرنے والے بیشتر ممالک کو قومی معیشت کی کمزوری کا سامنا ہے۔ سبھی چاہتے ہیں کہ معیشت زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو اور عالمی معیشت میں پیدا ہونے والی کسی بھی بڑی منفی تبدیلی کے اثرات جھیلنے کی پوزیشن میں رہے۔ سعودی عرب نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ نومبر کے دوران پیداوار میں کمی کردی گئی تھی اور اب مزید کمی کی گنجائش نہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عالمی منڈی میں تیل کی قیمت بڑھتے ہی سعودی عرب اس کا فائدہ اٹھانے کے لیے پیداوار میں اضافہ کردے۔

امریکا نے سعودی عرب اور تیل برآمد کرنے والے دیگر ممالک کو بالواسطہ طور پر خبردار کردیا ہے کہ تیل کی پیداوار میں غیر معمولی کمی نہ کی جائے کیونکہ اس کے نتیجے میں عالمی منڈی میں تیل کی قیمت بڑھے گی۔ صدر ڈونلڈ ٹرمپ چاہتے ہیں کہ تیل کی پیداوار موجودہ سطح پر رہے یا بڑھائی جائے تاکہ عالمی منڈی میں تیل کی قیمت نیچے رہے اور مغرب کو اضافی بوجھ نہ اٹھانا پڑے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ سعودی صحافی جمال خاشقجی کے قتل اور ایران کے خلاف پابندیوں کے نفاذ سے معاملات پھر پیچیدگی اختیار کرتے جارہے ہیں۔ ایسے میں اوپیک کے ارکان شدید مخمصے میں ہیں کہ کیا کریں، کس سمت جائیں۔ تیل کی پیداوار گھٹانے پر امریکا کی طرف سے غیر معمولی نوعیت کے اقدامات خارج از امکان نہیں اور دوسری طرف رسد بڑھانے پر عالمی منڈی میں تیل کی قیمتیں مزید نیچے آنے کا احتمال ہے۔ ایسی صورت میں قومی معیشتیں شدید بحران سے دوچار رہوں گی۔

ٹرمپ انتظامیہ نے ایران کی تیل کی برآمدات پر پابندی لگانے کے حوالے سے احتیاط اور دانش مندی سے کام لیا ہے۔ ایک طرف تو ایران کو تیل کی پیداوار کم کرنے پر مجبور بھی کیا گیا ہے اور دوسری طرف چند ایک ممالک کو ایران سے تیل درآمد کرتے رہنے کی اجازت دے کر اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ عالمی منڈی میں رسد کے حوالے سے پیچیدہ صورتِ حال پیدا نہ ہو۔ امریکا چاہتا ہے کہ جب تک ایران کے خلاف پابندیوں سے چند ممالک کا استثنیٰ ختم ہو تب تک عالمی منڈی میں رسد کے حوالے سے صورتِ حال موافق ہوجائے۔

اوپیک کے ویانا کے مرکزی اجلاس میں اس بات کا

باقی صفحہ نمبر ۴